مجلس ادارت

۱. مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی۔ کلکتہ ۲. پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

۳. مولانا سید محمد رابع ندوی لکھنؤ ۴. پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ ۵. ضیاء الدین اصلاحی (مرتب)

## معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتے کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔



فہرست

# مضمون نگاران معارف

۱۶۶ویں جلد

## ماہ جولائی ۲۰۰۰ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

# مضامین معارف

جلد ۱۶۶

ماہ جولائی ۲۰۰۰ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۶۶ ماہ ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۰ء عدد ۱

## فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# شذرات

بمبئی میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور اس کے موسس علامہ شبلیؒ کے قدردانوں کا وسیع حلقہ ہے، اعظم گڈھ کے بہت سے لوگ وہاں اپنی تجارت و ملازمت کی وجہ سے بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ سب ہی خصوصاً علمی مذاق رکھنے والے ان کے اور ان کی یادگار دارالمصنفین کے عاشق و شیدائی ہیں، علامہ شبلی کو بھی بمبئی سے والہانہ تعلق تھا وہ جب اپنے علمی، تعلیمی، قومی، ملی کاموں سے تعب و تکان محسوس کرتے تو فرحت و تازگی حاصل کرنے بمبئی چلے جاتے یہیں کی پرسکون اور خوشگوار فضا میں سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا آغاز ہوا، اس وقت انجمن اسلام بمبئی کا پودا برگ و بار لا رہا تھا جس کی آبیاری میں ان کا بھی حصہ رہا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "عربوں کی جہاز رانی" کے عنوان سے لکچر دیے، دارالمصنفین کے قدیم رفیق سید نجیب اشرف ندوی صاحب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور سید شہاب الدین دسنوی مرحوم جنرل سکریٹری تھے، بمبئی دارالمصنفین کی مالی معاونت میں بھی پیش پیش رہتا تھا، ۶۵ء میں اس کی گولڈن جبلی منائی گئی تو اعظم گڈھ کی ایک نامور ہستی اور دارالمصنفین کے رکن رکین منشی عبدالعزیز انصاری مرحوم نے اپنے اثر و رسوخ سے جبلی کے اخراجات کے لئے خطیر رقم دلائی۔

---

انجمن اسلام کے موجودہ صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا، نائب صدر جناب عبدالمجید پاٹکا اور ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ ہے اور وہ اس سے انجمن کے قدیم رشتے کی تجدید و استحکام کے بڑے آرزومند ہیں، ان کی اس مبارک مہم میں اعظم گڈھ کے جناب رضوان فاروقی، محمد ہارون سابق پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک کالج، مولانا مستقیم احسن اعظمی اور پروفیسر خورشید نعمانی بھی شامل ہیں، ابھی اسی سال مارچ میں انجمن کے زیر اہتمام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر ہونے والے سمینار میں شرکت کے لئے جب یہ خاکسار بمبئی گیا تو ڈاکٹر محمد اسحاق نے انجمن کے ارکان و وابستگان سے تعارف اور میری ملاقات کے لئے ایک باوقار تقریب منعقد کی جسے حاضرین کے علمی و فقہی استفسارات نے علمی رنگ دے دیا تھا، اسی تقریب میں ڈاکٹر صاحب نے سیرت پر میری تقریر کا اعلان کیا جو حارث میموریل لکچر کے تحت ہر سال ہوا کرتی ہے، جون کے اوائل میں



ڈاکٹر آدم شیخ کے باضابطہ دعوت نامے سے معلوم ہوا کہ ۲۹؍ جون کو مجھے "حضرت محمدؐ کے نظم مملکت" کے عنوان سے تقریر کے بجائے مقالہ پڑھنا ہے، تاکہ وہ انجمن کے رسالے "نوائے ادب" میں شایع ہو۔

---

چنانچہ ۲۹؍ جون کو ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا کی صدارت میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے کیمپس میں سیرت کا جلسہ ہوا، قرآن مجید کی تلاوت کے بعد مولوی جنید احمد بنارسی نے مولانا سہیل کی اس نعت کے منتخب اشعار پڑھے جس کا مطلع یہ ہے:

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی — رفو ہوتا نہیں ہے صبح کا چاک گریبانی

ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس پر بڑا زور دیا کہ اسلام کو تشدد اور دہشت گردی سے کوئی واسطہ نہیں، راقم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مملکت کے دعوتی، مذہبی، سیاسی، ملکی، فوجی اور تعلیمی نظم و نسق پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر صاحب نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھے انجمن میں بار بار آنے کی دعوت دی، مہاراشٹر کے مشہور دانش ور ڈاکٹر رفیق ذکریا اپنی علالت کی بنا پر تشریف نہیں لاسکے تھے، ان کی کتاب "محمد اور قرآن" کی رسم اجرا میرے ہاتھوں ہوئی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی پر ڈاکٹر آدم شیخ کی کتاب اور نوائے ادب کے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نمبر کے اجرا کی رسم بھی اسی جلسے میں انجام پائی۔

---

میرے رفیق سفر ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے جلسہ شروع ہونے سے پہلے ہی بتادیا تھا کہ ۳۰؍ کی رات میں واپسی ہے جس کے بعد کسی اور پروگرام میں شرکت کا موقع نہیں تھا، انجمن کے رفیق جناب شمیم طارق کی کتاب "شرف محنت و کفالت" کے تیسرے اڈیشن کی اشاعت پر بھیونڈی میں ۳۰؍ ہی کو تقریب ہونے والی تھی اس کے

اور انجمن کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں اپنے ہی لکچر کے پروگرام کے لئے افسوس کے ساتھ معذرت کرنی پڑی۔ اپنے خاص عزیز محمد شاہد سلمہ کے یہاں دوبارہ **بھیونڈی جانے کا پروگرام بھی** ملتوی کرنا پڑا، لیکن میرے بہت مخلص دوست اور اردو کے اچھے اہل قلم محمد ایوب واقف صاحب کے اصرار کو رد نہ کرسکا، ان کی بیوی اور بچوں نے بڑی پذیرائی کی۔ وہیں میرے دیرینہ کرم فرما مولانا مختار احمد ندوی کی دعوت ملی، بڑی معذرت کی کہ ابھی مجھے کرلا میں اپنی بہن اور بعض دوستوں اور بزرگوں سے ملنا ہے مگر انھوں نے بہن کے گھر گاڑی بھجوادی اور انھوں نے اور ان کے صاحب زادے نے اپنی لائبریری اور دارالتصنیف کے شعبے دکھائے اور بہت سے منصوبوں پر تبادلۂ خیال کیا، وہاں سے ان کے ہم نام مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کررہے تھے، جب انہیں یہ بتایا کہ ابھی واپسی ہے تو وہ بہت افسردہ ہوئے۔

---

حکیم صاحب دارالمصنفین کے مخلص رکن ہی نہیں اس کی ترقی کے دل سے خواہاں بھی ہیں، ان کا اور ڈاکٹر عبدالکریم نائک کا عرصہ سے اصرار ہے کہ بمبئی میں ہفتہ دو ہفتہ رہ کر دارالمصنفین کے لئے مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ ایک آفسٹ پریس کی خریداری کا انتظام ہوسکے۔ میں نے انجمن اسلام کے جلسے میں بھی اس کا اظہار کیا، ہندوستان اور پاکستان میں بلا اجازت دارالمصنفین کی کتابیں چھاپی جارہی ہیں اور اب عرب ملکوں میں ان کے ترجمے بھی چھپ رہے ہیں، مولانا مختار احمد ندوی اور ان کے صاحبزادے نے کہا کہ اس کے سدباب کے لئے دارالمصنفین کی کتابیں شاندار اور عمدہ گٹ اپ کے ساتھ شائع کرنا ضروری ہے۔ اخلاقی اپیل کارگر ہونے والی نہیں۔



## مقالات

# انکیانو اور سعدی شیرازی

از پروفیسر نذیر احمد*

**۶۶۵ھ** کے شروع میں شادی بیتکچی ودمر خراج وصول کرنے کی غرض سے شیراز آئے لیکن چونکہ مستقل حاکم وہاں کوئی نہ تھا اس وجہ سے وہاں کے حالات ٹھیک نہ تھے۔ ۶۶۷ھ میں اباقا خاں پسر ہلاکو خاں نے انکیانو کو فارس کی حکومت پر متعین کردیا (وصاف ص ۱۱۲) اس زمانے میں ابش خاتون اتابک شیراز کے بلند منصب پر فائز تھی، اس زمانے میں ککچہ شیراز کا شحنہ تھا، انکیانو نے اس سے مواخذہ کیا اور چند دنوں بعد اس کو قتل کردیا، اس کے بعد وہاں کے امرا، وزرا، اعیان و اشراف مملکت کو گرفتار کرلیا (شیراز نامہ ص ۹۰) لیکن تاریخ وصاف میں ہے کہ کلچہ (بجائے ککچہ) دیوان اتابکی اور شحنگی شیراز پہ باسطو فائز تھا (ص ۱۱۱) یہ **قاضی القضاۃ** سید شرف الدین ابراہیم کے خروج کا زمانہ تھا سید ۶۶۳ھ میں قتل ہوگیا لیکن جب ہلاکو کو اہل شیراز کے خروج کی خبر ملی تو الّٰق بوہ جرم میں کہ اس نے شیراز میں قتل عام نہیں کیا سترہ کوڑے لگوائے لیکن سید کے قتل کی خبر سے مردم شیراز کے بے قصور ہونے کا ثبوت فراہم ہوگیا، شیراز میں منگولوں کی طرف سے کوئی مستقل حاکم نہ تھا تو اس کی وفات پر اباقا خاں نے اپنی تخت نشینی (۶۶۳ھ) کے چار سال بعد، ۶۶۷ھ میں انکیانو کو فارس کا مستقل حاکم بنایا (تاریخ وصاف ص ۱۱۲)

---

* شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

انکیانو بڑا ہوشیار و زیرک حاکم تھا، کچھ ہی وقت میں وہ اوضاع مملکت سے آگاہ ہو گیا، اس نے اطراف کے حاکم بڑی ہوشیاری سے مقرر کئے اور ہر ایک کے مرتبے کے اعتبار سے انہیں خلعت دے کر نوازا، اس کا خیال تھا کہ اگر شحنہ اور عمال کو معیشت کے اعتبار سے فارغ البال نہ کیا گیا تو حکومت کا کام اچھی طرح سے انجام پذیر نہ ہوگا، جب وہ کسی کو حکومت پر بھیجتا تو اس سے عدل وانصاف کرنے کا وعدہ لیتا اور اگر اس سے کام کی انجام دہی میں غفلت ہوتی تو اسے سخت سزا دیتا، کبھی کبھی اسے قتل بھی کر دیتا، اس طرح سے اس نے بہت مال جمع کیا اور ملک آباد اور امن و امان بحال ہوا (وصاف ص ۱۱۲)

انکیانو نے کلچہ کو قید کر دیا، اتابک ابش کو یہ بات بڑی لگی تو اس کے غلام اور کلچہ کے دوست احباب جمع ہوئے اور انہوں نے انکیانو کے گھر کا محاصرہ کر لیا لیکن انکیانو کا کچھ بگاڑ نہ سکے بلکہ خود کلچہ گرفت میں آ گیا، اس کے حکم سے کلچہ قتل کر دیا گیا اور اسے محل سے نیچے پھینک دیا گیا، اس کے نتیجے میں کلچہ کے ساتھی اور لشکر تتر بتر ہو گئے۔ بعد میں اتابک ابش نے انکیانو سے کلچہ کے قتل کے سلسلے میں باز پرس کی تو اس نے ہلاکو کا وہ حکم دکھایا جس میں کلچہ کے قتل کے بارے میں کہا گیا تھا، اس طرح وقتی طور پر فتنہ رک گیا (وصاف ص ۱۱۳)

اسی درمیان چند اکابر دولت ایلخان (اباقا) کے پاس گئے اور اس سے بیان کیا کہ انکیانو شیراز کو برباد کرنے اور مملکت کے تباہ کرنے میں مشغول ہے اور سلطنت کی ہوس اس کے دل میں ہے، لوگوں نے اس کا ایک سکہ دکھایا جو اس کے عہد حکومت میں ڈھلا تھا، ایلخان کو لوگوں کی بات کا یقین آ گیا تو اس نے انکیانو کو شیراز سے واپس بلایا اور مورد باز پرسی قرار دیا (وصاف ص ۱۱۳)



جب انکیانو پر جرم ثابت ہو گیا تو اس نے عرض کیا جو مال اس نے جمع کیا وہ سرکاری کا ہے، میری مثال تو خازن کی ہے، جب حکم ہوگا یہ مال سرکاری خزانے میں داخل کر دیا جائے گا رہا یہ الزام کہ میں نے نظم امور میں غفلت برتی ہے تو عرض ہے کہ میں تو ایک چھوٹا سا کارمند ہوں اور شیراز اور متعلقہ علاقے ایک بڑی مملکت کی تشکیل کرتے ہیں۔ گویا اتنی بڑی مملکت کے جزئیات کی نگرانی بڑا مشکل کام ہے۔ اس طرح کے دلائل سے وہ موت کی سزا سے بچ تو گیا لیکن دوسری سزا سے نہیں بچ سکا، اس کو قبلا قاآن کے دربار میں حاضری دینا تھی، دربار تک پہنچنے کا راستہ نہایت دشوار گزار، سخت اور پرخطر تھا، اگر دربار کی حاضری سے بچ جاتے تو انہیں باغیوں سے جنگ کرنے بھیج دیا جاتا (وصاف ص ۱۱۳)

انکیانو کے بعد سوغونجاق نوئین کو شیراز بھیجنے کا حکم صادر ہوتا ہے اور وہ وہاں ۶۷۰ھ میں پہنچ جاتا ہے (وصاف ص ۱۱۳، شیراز نامہ ص ۹۰) شیراز پہنچ کر وہ وہاں کے انتظام سنبھالنے میں لگ جاتا ہے وہ مولانا ناصر الدین بیضاوی کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کرتا ہے، پھر وہ ایلخانی دربار واپس چلا جاتا ہے، اس درمیان شیراز کی حکمراں اتابک ابش خاتون ہی تھی، سوغونجاق کے بعد ۶۷۰ھ میں شمس الدین محمد ملک یہود فارس کا حاکم مقرر ہوا، اس کے ایک سال بعد نکودار کے لشکر کا ہجوم فارس کے اطراف میں سرہوا (شیراز نامہ ص ۹۱) ۶۷۸ھ میں امیر سوغونجاق محاسبات کی تحقیق کے لئے اباقا خاں کی طرف سے دوبارہ بھیجا جاتا ہے،[1] اس زمانے میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے شیراز و متعلقہ علاقے زبردست قحط کی زد میں آ گئے، سوغونجاق کے آتے ہی بارش ہو گئی اور رعایا کی پریشانی دور ہو گئی۔ ۶۷۹ھ[2] میں خواجہ نظام الدین وزارت کے

---

[1] شیراز نامہ ص ۹۲ [2] ایضاً۔

عہدے پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی برطرف ہوگئے، غرض نئے تقررات اور عجلت سے
ان کی برطرفی زمانے کا شعار ہوگیا تھا، اس جگہ محقق بڑی پریشانی کا شکار ہوجاتا ہے،
اس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سیاسی اقتدار کی باگ ڈور کس شخصیت کے ہاتھ میں ہوتی، اتنا
معلوم ہے کہ ایلخانی دربار سے آتابک، منگولی حاکم شیراز اور دوسرے عہدے دار کا آپس
میں کس طرح کا تال میل تھا، منگولی حاکمان شیراز و فارس اور اتابکان فارس کس کے
ماتحت تھے، منگولی حاکم اتابک فارس کے ماتحت ہوتے، یا وہ براہ راست ایلخانی دربار
کے ماتحت ہوتے، پھر یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ قاضی القضاۃ اور حکام فارس ایلخان سے
متعلق ہوتے یا اتابکان فارس سے، گو اتنی بات صحیح ہے کہ جہاں وہ اتابکان کی سربراہی میں
ہوتے وہیں وہ ایلخانی دربار سے جڑے ہوتے، خلاصہ یہ کہ اس دور کی چار اتھارٹیز ہیں،
اول قاآن جو سب سے بڑی اتھارٹی تھی، دوم ایلخان جو قاآن کے ماتحت تھے، لیکن
سارے مغربی ممالک محروسہ کے پورے نظم و نسق کے مالک ایلخان ہی تھے، تیسرے
اتابکان شیراز جن کا تقرر ایلخان کے حکم سے ہوتا، چوتھا حکام فارس تھے جن کا تقرر ایلخانی
بادشاہ کرتے تھے، لیکن تیسرے اور چوتھے کے اختیارات کے حدود تاریخوں میں متعین
نہیں، اسی وجہ سے آپس میں اکثر بڑے اختلافات رہتے، ان کا فیصلہ ایلخانی دربار سے
ہوتا تھا، باوجود ایلخانیوں کی بالادستی کے اتابکان اور دوسرے حکام کے درمیان بڑا
اختلاف رہتا تھا اور اس کی وجہ سے قتل و غارت کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

اتابک ابش خاتون ۶۶۲ھ سے ۶۸۴ھ تک شیراز کے اتابکی کے عہدے پر سرفراز
رہی، گویا ۲۲ سال تک شیراز کی حکمراں رہی[1] اس دوران پہلے انکیانو ایلخانی دربار سے

[1] شیراز نامہ ص ۹۳-۹۴۔



شیراز کا حاکم مقرر ہوا، پھر اس پر الزام ہوا اور وہ واپس بلالیا گیا اور اس پر جو بڑا الزام
عائد ہوا تھا اس کی تحقیق کی گئی تو وہ مجرم ثابت ہوا تو اسے قاآن[1] کے دربار بھیج دیا گیا،
اس کے بعد سوغونجاق[2] نوئین کئی سال فارس کا حاکم رہا۔

اتابک ابش خاتون اور انکیانو کے تعلق خراب رہے، اس کے نتیجے میں انکیانو کو
شیراز سے ہٹایا گیا، لیکن انکیانو بڑی شخصیت کا مالک تھا، ملکی انتظام میں بڑی مہارت
رکھتا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ[3] بڑا دانشمند تھا، علوم و فنون سے اس کو بڑا
سروکار تھا، علماء و فضلاء کی محفل میں حاضر ہوتا اور ان سے اہم امور پر سوال جواب
کرتا، ملکی انتظام میں مہارت کی وجہ سے اس نے کافی اموال جمع کرلئے اور ملک میں
امن و امان قائم ہوگیا، تاریخ وصاف میں ہے کہ انکیانو دینی و علمی مسائل میں بڑی بصیرت
رکھتا تھا، چنانچہ وحدت الوجود، صدق بعثت انبیاء، علوم برہانی کے بارے میں اس دور
کے علماء و فضلاء سے بحث کرتا تھا، جوابات نامعقول پر خطہائے سخت سے نہیں چوکتا
تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیخ الشیوخ نجیب الدین علی بن بزغش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں
حاضر ہوا اور انسان اور اس کے مرتبے کے بارے میں شیخ سے سوال کیا، شیخ نے بڑے
مدلل انداز میں ان امور کا جواب دیا لیکن ابھی ان کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ انکیانو اٹھا
اور محفل سے چلا گیا، اس کے بعد ایک شخص کے ذریعے معذرت کا خط بھیجا جس کا مضمون
یہ تھا کہ مجلس سے اٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا لیکن اگر شیخ کی گفتگو آخر تک سنتا
تو آباء و اجداد کے مذہب کو چھوڑنا پڑتا۔ (تاریخ وصاف ص ۱۱۲-۱۱۳)

شیخ سعدی کے دیوان میں انکیانو کی مدح میں تین اخلاقی قصیدے ہیں ان قصیدوں

[1] تحریر وصاف ص ۱۱۳ [2] ایضاً ص ۱۱۴ [3] ایضاً ص ۱۱۲۔

ہیں قدیم قصیدہ نگاری کے اصول کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے، نہ ان میں تشبیب کی دھوم ہے، نہ ممدوح کی مدح میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں، نہ گریز کی نکتہ آفرینی، ان میں صرف ممدوح کو طرح طرح سے نصیحتیں کی گئی ہیں اور ان میں ایسے شاعرانہ نکتے بیان ہوئے ہیں کہ جن کی وجہ سے ........ ان کا درجہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ وہ بطور شاعرانہ اعجاز کی بہترین مثالیں ہیں، ساتھ ساتھ شاعر نے بے باکانہ اپنے بہترین اشعار کے ذریعے ممدوح کو طرح طرح سے نصیحتوں سے مالا مال کر دیا ہے اور بغیر تکلف کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصیدے شاعرانہ اعجاز کی بہترین مثالیں ہیں، ذیل میں تینوں قصیدوں کے ضروری اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

### در مدح امیر انکیانو

بس بگردید و بگردد روزگار — دل بدنیا در نبندد هوشیار

ای که دستت می رسد کاری بکن — پیش از ان کز تو نیاید هیچ کار

ای که وقتی نطفه بودی بی خبر — وقت دیگر طفل بودی شیرخوار

مدتی بالا گرفتی تا بلوغ — سرو بالائی شدی سیمین عذار

همچنین تا مرد نام آور شدی — فارس میدان و صید و کارزار

آنچه دیدی برقرار خود نماند — وانچه بینی هم نماند برقرار

دیر و زود این شکل و شخص نازنین — خاک خواهد بودن و خاکش غبار

این همه هیچست چون می بگذرد — تخت و بخت و امر و نهی و گیر و دار

نام نیکو گر بماند ز آدمی — به کزو ماند سرای زرنگار

خفتگان بیچاره در خاک لحد — خفته اندر کله سر سوسمار

۴۱۹



صورت زیبای ظاهر هیچ نیست — ای برادر سیرت زیبا بیار

چون خداوندت بزرگی داد و حکم — خرده از خردان مسکین درگذار

شکر نعمت را نکوئی کن که حق — دوست دارد بندگان حق گزار

نام نیک رفتگان ضایع مکن — تا بماند نام نیکت پایدار

کام درویشان و مسکینان بده — تا همه کارت بر آرد کردگار

با غریبان لطف بی اندازه کن — تا رود نامت به نیکی در دیار

از درون خستگان اندیشه کن — وز دعای مردم پرهیزگار

ای که داری چشم عقل و گوش هوش — پند من در گوش کن چون گوشوار

نشکند عهد من الا سنگدل — نشنود قول من الا بختیار

سعدیا چندانکه میدانی بگوی — حق نباید گفتن الا آشکار

هر کرا خوف و طمع در کار نیست — از خطا باکش نباشد وز تتار

دولت نوئین اعظم شهریار — انکیانو سرور عالی تبار

بادشاهان را ثنا گویند و مدح — من دعائی می کنم درویش وار

(کلیات ص ۲۲۴-۲۲۵)

دوسرے قصیدے کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

بسی صورت بگردیدست عالم — وزین صورت بگردد عاقبت هم

عمارت با سرای دیگر انداز — که دنیا را اساسی نیست محکم

مثال عمر، سر بر کرده شمعی است — که کوته باز می باشد دمادم

و یا برف گداز ان بر سر کوه — کزو هر لحظه جزوی می شود کم

نہ چشم طامع از دنیا شود سیر　　نہ ہرگز چاہ پر گردد ز شبنم
وفاداری مجوی از دہر خونخوار　　محالست انگبین در کام ارقم
حرامش باد ملک و پادشاہی　　کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
سخن شیرین بود پیر کہن را　　ندانم بشنود نوئین اعظم
جہان سالار عادل انکیانو　　سپہدار عراق و ترک و دیلم
کہ روز بزم بر تخت کیانی　　فریدونست و روز رزم رستم
چنین پند از پدر نشنودہ باشی　　الا گر ہوشمندی بشنو از عم
چو یزدانت مکرم کرد و مخصوص　　چنان زی در میان خلق عالم
کہ گر وقتی مقام پادشاہیت　　نباشد ہمچنان باشی مکرم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ　　سخن ملکی است سعدی را مسلم
مقامات از دو بیرون نیست فردا　　بہشت جاودانی یا جہنم
بکار امروز تخم نیکنامی　　کہ فردا بر خوری واللہ اعلم
مدامت بخت و دولت ہمنشین باد　　بدولت شادمان از بخت خرم

(کلیات ص ۳۲، ۳۳)

تیسرے قصیدے کے کچھ اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

دنیا نیرزد آنکہ پریشان کنی دلی　　زنہار بد مکن کہ نکردست عاقلی
این پنج روزہ مہلت ایام آدمی　　آزار مردمان نکند جز مغفلی
باری نظر بخاک عزیزان رفتہ کن　　تا مجمل وجود ببینی مفصلی
درویش و پادشہ نشنیدم کہ کردہ اند　　بیرون ازین دو لقمۂ روزی تناولی



زان گنجہای نعمت و خروارہای مال　　با خویشتن بگور نبردند خردلی
از مال و جاہ و منصب و فرمان و تخت و بخت　　بہتر ز نام نیک نکردند حاصلی
بعد از ہزار سال کہ نوشیروان گذشت　　گویند از ہنوز کہ بودست عادلی
بعد از خدای ہر چہ تصور کنی بعقل　　ناچارش آخریست ہمیدون کرا ولی
خواہی کہ رستگار شوی راستکار باش　　تا عیب جوی را نرسد بر تو مدخلی
تیر از کمان چو رفت نیاید بشست باز　　پس واجبست در ہمہ کاری تاملی
وقتی بلطف گوی کہ سالار قوم را　　با گفتگوی خلق بباید تحملی
وقتی بقہر گوی کہ صد کوزۂ نبات　　گہ گہ چنان بکار نیاید کہ حنظلی
مرد آدمی نباشد اگر دل نسوزدش　　باری کہ بیند و خری افتادہ در گلی
ہرگز بہ پنج روزہ حیات گذشتنی　　خرم کسی شود مگر از موت غافلی
نی کاروان برفت و تو خواہی مقیم بود　　ترتیب کردہ اند ترا نیز محملی
گر من سخن درشت نگویم تو نشنوی　　بی جہد از آینہ نبرد زنگ صیقلی
حق گوی را زبان ملامت بود دراز　　حق نیست اینچہ گفتم اگر ہست گو بلی
خاص از برای وسوسۂ دیو نفس را　　شاید گر این سخن بنویسی ہیکلی
این فکر بگیر من کہ بحسنش نظیر نیست　　مردم مخوان اگر دہمش جز بجاہلی
و آن کیست انکیانو کہ دادار آسمان　　داد ست مر ورا ہمہ حسن و شمایلی
نوئین اعظم آنکہ بتدبیر و فہم و رای　　امروز در بسیط ندارد مقابلی
منت پذیر او نہ منم در زمین پارس　　در حق کیست آنکہ ندارد تفضلی
عمرت دراز باد نگویم ہزار سال　　زیرا کہ اہل حق نپسندند باطلی

نہ چشم طامع از دنیا شود سیر  نہ ہرگز چاہ پُر گردد ز شبنم

وفاداری مجوی از دہر خونخوار  محالست انگبین در کام ارقم

حرامش باد ملک و پادشاہی  کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم

سخن شیرین بود پیر کہن را  ندانم بشنود نوئین اعظم

جہان سالار عادل انکیانو  سپہدار عراق و ترک و دیلم

کہ روز بزم بر تخت کیانی  فریدونست و روز رزم رستم

چنین پند از پدر نشنودہ باشی  الا گر ہوشمندی بشنو از عم

چو یزدانت مکرم کرد و مخصوص  چنان زی در میان خلق عالم

کہ گر وقتی مقام پادشاہیت  نباشد ہمچنان باشی مکرم

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ  سخن ملکی است سعدی را مسلم

مقامات از دو بیرون نیست فردا  بہشت جاودانی یا جہنم

بکار امروز تخم نیکنامی  کہ فردا بر خوری واللہ اعلم

مدامت بخت و دولت ہمنشین باد  بدولت شادمان از بخت خرم

(کلیات ص ۳۲، ۳۳)

تیسرے قصیدے کے کچھ اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

دنیا نیرزد آنکہ پریشان کنی دلی  زنہار بد مکن کہ نکرد است عاقلی

این پنج روزہ مہلت ایام آدمی  آزار مردمان نکند جز مغفلی

باری نظر بخاک عزیزان رفتہ کن  تا مجمل وجود ببینی مفصلی

درویش و پادشہ نشنیدم کہ کردہ اند  بیرون ازین دو لقمۂ روزی تناولی



زان گنجہای نعمت و خروارہای مال  با خویشتن بگور نبردند خردلی

از مال و جاہ و منصب و فرمان و تخت و بخت  بہتر ز نام نیک نکردند حاصلی

بعد از ہزار سال کہ نوشیروان گذشت  گویند ازو ہنوز کہ بود است عادلی

بعد از خدای ہر چہ تصور کنی بہ عقل  ناچارش آخریست ہمیدون کہ اولی

خواہی کہ رستگار شوی راستکار باش  تا عیب جوی را نرسد بر تو مدخلی

تیر از کمان چو رفت نیاید بشست باز  پس واجبست در ہمہ کاری تاملی

وقتی بلطف گوی کہ سالار قوم را  با گفتگوی خلق بباید تحملی

وقتی بقہر گوی کہ صد کوزۂ نبات  گہ گہ چنان بکار نیاید کہ حنظلی

مرد آدمی نباشد اگر دل نہ سوزدش  باری کہ بیند و خری افتادہ در گلی

ہرگز بہ پنج روزہ حیات گذشتنی  خرم کسی شود مگر از موت غافلی

نی کاروان برفت و تو خواہی مقیم بود  ترتیب کردہ اند ترا نیز محملی

گر من سخن درشت نگویم تو نشنوی  بی جہد از آینہ نبرد زنگ صیقلی

حق گوی را زبان ملامت بود دراز  حق نیست اینچہ گفتم اگر ہست گو بلی

خاص از برای وسوسۂ دیو نفس را  شاید گر این سخن بنویسی ہیکلی

این فکر بگیر من کہ بجنسش نظیر نیست  مردم مخوان اگر دہمش جز بجاہلی

وآن کیست انکیانو کہ داد آسمان  داد دست مرو را ہمہ حسن و شمایلی

نوئین اعظم آنکہ بتدبیر و فہم و رای  امروز در بسیط ندارد مقابلی

منت پذیر او نہ منم در زمین پارس  در حق کیست آنکہ ندارد تفضلی

عمرت دراز باد نگویم ہزار سال  زیرا کہ اہل حق نپسندند باطلی

نفست ہمیشہ پیرو فرمان شرع باد — تا بر سرش ز عقل برادری موکلی

(کلیات ص ۵۵، ۵۷-۵۸)

اگرچہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے انکیانو مسلمان نہیں تھا، اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کا وہ گفتگو ہے جو شیخ نجیب الدین علی بن بزغش سے ہوئی جس سے وہ اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اگر اس مجلس میں کچھ دیر اور بیٹھا رہتا تو مسلمان ہو جاتا، سعدی بھی اس کو شرع کے پیرو ہونے کی نصیحت کرتے ہیں، شرع کی پیروی گویا عقلی ہدایت ہے، جو شرع کا پیرو ہے بے لگام نہیں ہو سکتا، اس کو عقل کی روشنی میں کام کرنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا سعدی نے اس کو مسلمان ہونے اور شرع محمدی کی پابندی کی جس طرح نصیحت کرتے ہیں اس سے ان کی جرات مندی کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔

اناکیانو کی شخصیت اس دور کی ایک باکمال شخصیت تھی، وہ اعلیٰ درجے کا حکمراں تھا، اس کی وجہ سے فارس کے علاقے کی ابتری بڑی حد تک ختم ہوئی، پھر وہ بڑا ذی علم تھا، اسلام کے جاننے اور سمجھنے کا وہ بڑا شوق رکھتا تھا، ان وجوہ سے سعدی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھنے شروع کئے، ان قصیدوں میں شاعر نے جس طرح اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف کے بعد نصائح کئے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے، سعدی کا اس طرح سے اپنے ممدوح کا انتخاب قابل ستایش ہے، لیکن جہاں انہوں نے ایک عادل منگولی حکمراں کی تعریف اپنا موضوع بنایا ہے ان کو اپنے دور کے مسلمان علماء و فضلاء و مشائخ کی بھی مدح کرنا چاہئے۔ مجھے ان کے یہاں اس کمی کا بڑی شدت سے احساس ہے، سعدی کے عہد میں شیراز اور فارس مسلم علماء و فضلاء اور مشائخ و متصوفہ کا زبردست مرکز تھا، چنانچہ اس دور کی کتابوں کا یہی موضوع تھا، ان میں شد الازار اور شیراز نامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،



اس ضمن میں اس دور کی تاریخی تصانیف بھی قابل توجہ ہیں، جن میں تاریخ وصاف خصوصیت سے قابل مطالعہ ہے، لیکن سعدی کے قصائد میں صرف ایک قصیدہ اس دور کے قاضی القضاۃ قاضی رکن الدین یحییٰ پسر مجد الدین اسماعیل پسر بیکرو رفالی کی مدح میں ہے اور بقیہ کوئی شخص یا فاضل ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ اس سلسلے میں ایک نہایت عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ سعدی اپنے دور کے اور افاضل و شعراء کی طرح شیخ شہاب الدین سہروردی سے متاثر تھے۔ شد الازار میں ہے کہ ان کو شیخ کی صحبت ملی تھی وہ ان کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہوئے تھے اور بہت سے اولیاء کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے (شد الازار ص ۴۶۱ اور ہزار مزار تصحیح نورانی وصال شیراز ۱۳۶۴ ص ۳۷۵) لیکن اس کے باوجود انہوں نے شیراز کے مشہور مشائخ کو جو سہروردی شیخ کے پیرو تھے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ذیل میں سہروردی سلسلے کے مشائخ کے خاندان کے تین فرد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو سعدی کی توجہ میں نہیں آئے، اس خاندان کے سب سے مشہور شیخ نجیب الدین علی بن بزغش، پھر ان کے بیٹے شیخ ظہیر الدین عبد الرحمن بن نجیب الدین علی پھر ان کے پر پوتے شیخ صدر الدین جنید، شد الازار میں مذکور ہیں، ان کے حالات کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

**شیخ نجیب الدین علی بن بزغش**: شیخ نجیب الدین عالم، عارف، محقق، منبع حقائق و معارف تھے، ان کے باپ ایک بڑے تاجر تھے جو شام سے آکر شیراز میں متوطن ہو گئے تھے اور یہیں انہوں نے شادی کی۔ ایک رات حضرت علی کو خواب میں دیکھا، وہ فرما رہے تھے کہ نجیب نام کا ایک بچہ تمہارے یہاں پیدا ہوگا، اس کا نام میرے نام پر

[1] قاضی شرف الدین محمد کی بیٹی سے، ان کے حالات کے لئے دیکھئے شد الازار ص ۲۹۲-۲۹۳۔

دکھا، پس اس بچے کا نام نجیب الدین علی رکھا گیا، باپ نے بیٹے کو بڑے ناز و نعمت سے پالا، جامہ ہائے فاخرہ پہنائے، مگر بیٹے نے فاخرہ لباس کے پہننے سے انکار کیا کہ وہ ایسے لباس کو عورتوں کا لباس کہتا تھا، اسی طرح اچھے کھانوں سے انکار کیا کہ وہ اسے مالداروں کا کھانا کہتا تھا، بڑا ہوا تو عرفان کی طلب ہوئی، وہ گئے اور ایک خالی گھر میں منزوی ہوگئے، ایک رات خواب دیکھا کہ ایک شیخ، شیخ کبیر کے بقعہ سے نکلے اور ان کے پیچھے ایک شکل و صورت کے چھ نفر تھے۔ جب شیخ نے نجیب کو دیکھا تو مسکرائے اور ان کا ہاتھ پکڑا اور پھر دوسرے شیخ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تیرے لئے ایک امانت تھی، جب نجیب الدین اٹھے تو یہ خواب باپ سے بیان کیا، انہوں نے اس زمانے کے مجانین عقلا شیخ ابراہیم[1] کی خدمت میں یہ خواب بیان کیا، شیخ ابراہیم نے فرمایا کہ شیخ اول شیخ کبیر ہیں اور باقی چھ دوسرے مشائخ تو یہ وہ لوگ ہیں جو ان کے طریقہ کے پیرو ہیں، ان میں ایک زندہ ہیں، جن کی تلاش کرنی چاہئے، شیخ نجیب ان کی تلاش میں نکلے، مکہ معظمہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات ۶۳۲) کی خدمت میں پہنچے تو ان کی وہی صورت پائی خواب میں جن کے ہاتھ میں شیخ نجیب کا ہاتھ دیا گیا تھا، شیخ سہروردی نے اس خواب کو دہرایا جو شیخ نجیب دیکھ چکے تھے، پس شیخ نجیب چند سال ان کی خدمت میں رہے اور ان کی تصانیف پڑھیں، مکہ سے واپس[2] ہوئے تو شادی کی، خانقاہ بنائی اور ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، اسی درمیان شیخ جمال الدین[3] سے مناظرہ ہوا، شیخ نجیب نے کہا کہ میں جس طریقہ پر

---

[1] کتاب عوارف المعارف با خرقہ و مسانید و اجازات مصحوب او گردانید شیراز نامہ ص ۲۷۷۔

[2] ان کے حالات کے لئے دیکھئے نفحات الانس چاپ عابدی ص ۴۷۸ [3] دیکھئے نفحات، ص ۳۸۰۔



چل رہا ہوں وہ ترقی پذیر ہے اسی پر مناظرہ ختم ہوا، ان کی وفات ۶۷۸ ہجری میں واقع ہوئی اور وہ اپنے بقعہ میں دفن[1] ہوئے (شد الازار ص ۳۳۴-۳۳۸ و ہزار مزار ۳۷۳-۳۷۵)

**شیخ ظہیر الدین عبدالرحمٰن** : شیخ ظہیر الدین شیخ نجیب الدین علی کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے اور لوگوں میں بہت مقبول تھے، ابھی یہ ماں کے شکم میں تھے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے اپنے خرقے کا کچھ حصہ پھاڑ کر اس بچے کے لئے بھیجا، جب بچہ پیدا ہوا تو اسے یہ خرقہ پہنایا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر معرفت کے دروازے کھول دئے اور علوم و معارف ان کو سکھائے، وہ باپ کی خدمت میں بڑے مشاق تھے۔ چنانچہ باپ کی خدمت کی برکت سے ان کو بڑا فائدہ ہوا، کہتے ہیں جس رات ظہیر الدین عازم حج تھے، باپ نے خواب میں دیکھا کہ شب عرفہ وہ روضۂ مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوئے اور سلام کیا، تو حجرہ سے آواز آئی "وعلیک السلام یا ابا النجاشی" جب اسے اس بات کی اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئے اور کہا مراد حاصل ہوگئی، اس کے بعد ظہیر الدین نے علم حدیث کا درس لیا اور مدرس ہوگئے اور پھر تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ ان کی تصانیف میں ترجمۂ عوارف المعارف ہے جس میں کافی تحقیق کی گئی ہے[2]۔ اس کے بعد کافی لوگ ان کے طریقہ پر چلنے لگے اور بعض لوگوں نے شیخ سے خرقہ حاصل کیا اور بڑے درجے پر پہنچے، شیخ صاحب کرامات تھے ان کے سخنان یہ ہیں:

بدرستی و راستی کہ من در وصل بودم و رضا بآن نمی دادم بعد از آن می دانستم کہ بالاتر از رضا خوی نمودن بر رضا بود، پس قناعت کردم بخوشی نفس خود کہ مسلمان باشیم و در

---

[1] شد الازار میں ان کے لئے قاضی سید مجتبیٰ عثمانی کے چھ عرب کے شعر درج ہیں، شیخ نجیب الدین علی کے حالات کے لئے دیکھئے نفحات الانس ص ۴۷۴، بعد [2] دیکھئے نفحات الانس ص ۴۷۴۔

۱۵ رمضان ۷۱۶ ہجری انتقال فرمایا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہوئے (شد الازار ص ۳۳۸-۳۳۹، ہزار مزار ص ۳۷۵-۳۷۶)

**شیخ صدر الدین جنید:** شیخ جنید کے باپ فضل اللہ بن عبد الرحمٰن تھے، گویا شیخ مذکور شیخ ظہیر الدین عبد الرحمٰن کے پوتے[۱] تھے، اپنے زمانے کے پیشوا تھے، مرشد کامل و فاضل تھے، علم ظاہر و باطن میں بڑا کمال رکھتے تھے، بغداد میں شیخ جبرئیل[۲] کی خدمت میں رہا کرتے، ایک مدت تک گوشہ نشینی اختیار کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر علوم کے دروازے کھول دئے، کعبۂ معظمہ کی زیارت دو بار کی اور کچھ وقت وہاں مجاور رہے، شام کے ملک میں بھی پھرے تھے، ان کے مشائخ میں ایک شیخ جمال الدین[۳] حنبلی بعلبکی تھے، دوسرے شیخ صلاح الدین[۴] خلیل بن کیکلدی و تیسرے شیخ علاء الدین[۵] علی مقدسی اور چوتھے ایک خاتون زینب[۶] بنت عبد الرحیم تھیں، شیخ جنید فرماتے تھے کہ موطای مالک ایک روز چھ مجلس اور جامع بخاری تیرہ روز میں ختم کیا تھا، ان کی تصانیف میں کئی کتابیں تھیں، ان میں نقاوۃ الاخبار حدیث میں اور ذیل المعارف عوارف کے ترجمہ میں۔

شیخ صدر الدین شیراز کے اکابر مشائخ میں تھے، چنانچہ بڑے بڑے مشائخ ان کے مریدوں میں تھے، انہیں میں شیخ افضل تھے، لوگ بڑی تعداد میں ان کے آداب و اطوار کی پیروی کرتے تھے، ان کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی اور اپنے باپ دادا کے قریب دفن ہوئے (شد الازار ص ۳۳۹-۳۴۰، ہزار مزار ص ۳۷۷-۳۷۸)

---

۱؎ دیکھئے شد الازار ص ۷۶، ۳ حاشیہ ۱۴۴ ۲؎ دیکھئے شد الازار ص ۷۷، ۳ ح، ان سے مراد شیخ جبرئیل کردی ہے ۳؎ دیکھئے شد الازار ص ۳ حاشیہ ۱۴۱، میں وفات پائی ۴؎ دیکھئے شد الازار ص ۷۷، ۳ حاشیہ نمبر ۱۶۰ ۵؎ دیکھئے شد الازار ص ۷۷، ۳ حاشیہ نمبر ۱۶۱ ۶؎ دیکھئے شد الازار ص ۷۷، ۳ حاشیہ نمبر ۱۶۹۔



قابل ذکر امر یہ ہے کہ راقم الحروف نے شیخ ظہیر الدین عبد الرحمٰن علی بن بزغش شیرازی پر ایک مفصل مقالہ انڈو ایرانیکا ج ۲۷، ۴۰، ۱۹۷۴ء میں شایع کیا تھا، اس مقالے میں اس خاندان کے تین افراد یعنی شیخ ظہیر الدین کے والد محترم شیخ نجیب الدین علی بزغش شیرازی، شیخ ظہیر الدین عبد الرحمٰن بن شیخ نجیب الدین علی اور شیخ صدر الدین جنید حفید ظہیر الدین عبد الرحمٰن کے حالات جمع کئے ہیں، تینوں شیخ شہاب الدین سہروردی کے پیرو تھے اور شیخ کی مشہور کتاب عوارف المعارف سے منسلک تھے، شیخ نجیب الدین علی نے عوارف کا ترجمہ نہیں کیا تھا، لیکن اس کا درس دیتے تھے، ظہیر الدین عبد الرحمٰن اور صدر الدین جنید نے اس کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا، راقم نے ظہیر الدین کے ترجمے کے دو نسخے علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں معلوم کئے، پہلا کافی پرانا ہے ۸۰۱ ہجری کی کتابت ہے اور ذخیرہ حبیب گنج شمارہ ۶۳/۲۱ میں موجود ہے، دوسرا نسخہ ایک مجموعہ ہے جو ۱۱۰۴ میں تحریر ہوا تھا۔

سعدی نے اتابکان شیراز، ان کے وزرا، اور بعض امرائے منگول کی مدح کی ہے، ان کی اواخر زندگی اتابک سعد بن زنگی (وفات ۶۲۲ھ) کے عہد سے متعلق تھی لیکن سعدی نے اس کا ذکر مطلق نہیں کیا اور نہ کوئی تحریر اس کی طرف منسوب کی، اسی طرح سعدی کے معاصر علماء و فضلاء و مشائخ و صوفیہ بھی ان کے ذکر سے محروم رہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ محض ایک دنیادار انسان تھے، اسی لئے ایسے اشخاص کی مدح میں ان کا زور قلم ختم ہوتا جن سے فوائد متوقع تھے، ان کا عہد علم و فضل کے لحاظ سے نہایت ممتاز دور تھا لیکن سعدی نے اپنے دور کے علم و فضل کو مطلقاً نظر انداز کر دیا۔

# اسلام کی عالمگیر تعلیمات پر ایک نظر

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی*

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی بنیاد انسانی مساوات، ذات پات اور رنگ و نسل کی نفی، آپسی بھائی چارہ کے فروغ اور تمام قوموں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام پر ہے اور اس کا بنیادی مقصد ایک ایسے عالمگیر انسانی معاشرے کی تشکیل ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اتحاد و یکجہتی کے ساتھ رہتے ہوئے پُرامن طور پر زندگی بسر کریں اور ہر قوم دوسری قوم کے مذہبی اور تہذیبی امور میں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے بلکہ ہر ایک پُرامن طور پر اپنے اپنے مذہب کا پرچار کرے تاکہ جسے جو مذہب پسند آئے وہ اسے اختیار کر سکے۔

**انسانی مساوات کا روح پرور نظارہ**

موجودہ دور میں "حقوق انسانی" پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ مختلف قوموں کے درمیان نسلی منافرت پیدا نہ کی جائے بلکہ سب کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کیا جائے اور اس سلسلے میں اقوام متحدہ کا ایک چارٹر بھی موجود ہے۔ مگر یہ سب کاغذی باتیں ہیں اور دنیا میں آج بھی رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق و امتیاز جاری ہے۔ یورپین قومیں اپنی رنگت کی بنا پر اپنی برتری کی آج بھی قائل ہیں۔ امریکہ میں کالوں کو گوروں کے برابر حقوق حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ کالوں کے چرچ

* ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور۔ ۲۹۔



تک الگ ہیں۔ ہندوستان میں طبقاتی فرق و امتیاز لاکھ کوششوں کے باوجود مٹ نہیں سکا ہے جو ہزاروں سال سے آج تک برابر جاری ہے۔ لیکن اسلام نے رنگ و نسل کے اس امتیاز کے خلاف ایک ایسی طاقتور تحریک چلائی کہ اس کے نتیجے میں دنیا نے آغاز اسلام ہی میں انسانی مساوات کا انوکھا نظارہ کیا جس میں کالے اور گورے، اور عربی و حبشی سب ایک ہی صف میں نظر آنے لگے۔ یہ اسلامی تعلیمات کا ایک جادو ہے۔ اسلام پوری نوع انسانی کو ایک خاندان اور ایک قبیلہ تصور کرتے ہوئے سب کو آدم کی اولاد قرار دیتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (نساء: ۱)

اے لوگو! اپنے رب (کارساز عالم) سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی فرد (آدم) سے پیدا کیا۔

اور اس بنا پر اسلام میں رنگ و نسل اور خاندانی تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ساری خصوصیات محض آپسی تعارف یا باہمی پہچان کی غرض سے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ اس مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

یا ایہا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی اعجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی۔

اے لوگو! سنو تمہارا رب ایک اور تم سب کا باپ بھی ایک ہے۔ جان لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی (غیر عربی شخص) پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی شخص پر کوئی برتری ہے۔ اسی طرح کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کسی قسم کا

فضل ہے سوائے تقویٰ (تقرب الی اللہ)
کے۔ (مسند احمد: ۵/۴۱۱، الفتح الربانی:
۱۲/ ۲۲۶)

**اسلام انسانیت کا نجات دہندہ** اس اعتبار سے اللہ کے نزدیک تمام انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں: ایک اس کے فرماں بردار یا اس سے زیادہ قربت رکھنے والے اور دوسرے اس کے نافرمان یا اس سے دوری اختیار کرنے والے۔ لہٰذا اسلام کی دعوت یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان اپنے خالق و معبود کو پہچان کر اس کی اطاعت و فرماں برداری اختیار کرلیں، تاکہ ان کی عاقبت درست ہوجائے۔

| | |
|---|---|
| یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ | اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو |
| الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ | جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو |
| قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۲۱) | پیدا کیا تاکہ تم اللہ والے بن سکو۔ |

اسلام کی بنیادی فکر اور اس کی اساسی دعوت یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور سارے انسان خالق کائنات کے مطیع و فرماں بردار بن کر رنگ و نسل کے بھید بھاؤ کو ختم کریں اور سب کے سب بھائی بھائی بن کر "جیو اور جینے دو" کے اصول پر کاربند ہوجائیں۔ اس کے نتیجے میں دنیا میں امن و امان اور سلامتی کا ایک نیا دور آئے گا اور مخلوق خدا کو راحت ملے گی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کی بنا پر انسانوں کو اخروی اعتبار سے نجات ملے گی اور ان کا انجام اچھا ہوگا۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں یہ دنیا چند روزہ اور فانی ہے اور اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جو "حیات جاودانی" ہوگی جس میں نیک لوگ مسرت و شادمانی کی زندگی گذاریں گے اور برے لوگوں کو طرح طرح سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔



اس اعتبار سے اسلام کی دعوت خداپرستی اور اخروی نجات کی دعوت ہے، جو انسانیت پسند اور سارے عالم کے لئے رحمت کا باعث اور دنیا کا نجات دہندہ ہے۔ اسی بنا پر اس کی دعوت عالمگیر ہے اور اس کا پیغام سارے جہان کے لئے ہے:

| | |
|---|---|
| وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ | (اے رسول) ہم نے آپ کو سارے |
| (انبیاء: ۱۰۷) | جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ |
| اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ | یہ (قرآن) سارے جہاں کے لئے ایک |
| (ص: ۸۷) | تذکرہ ہے۔ |

**اسلام کی حکیمانہ دعوت** اسلام میں زور و زبردستی نہیں ہے (بقرہ: ۲۵۶) یعنی وہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی دعوت بالکل فطری و عقلی اور حقیقت پسندانہ ہے جو دلوں کو چھونے اور دل کے دروازوں پر دستک دینے والی ہے اور اس میں بلا کی کشش و جاذبیت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ اس ہستی کا طریقۂ کار ہے جو فطرت انسانی کا رمز شناس ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری ہے کہ اہل اسلام لوگوں کو حکیمانہ اور بہتر پیرائے میں خدا کی طرف بلائیں:

| | |
|---|---|
| اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ | تم (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف حکمت |
| وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ | اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور |
| بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (نحل: ۱۲۵) | ان سے بہترین طریقہ سے مباحثہ کرو۔ |

اس اعتبار سے اسلام پُرامن تبلیغ کا داعی ہے جو زور و زبردستی کے بجائے بحث و مباحثے کا دروازہ کھولتا ہے اور لوگوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اپنی نجات کا راستہ خود منتخب کرلیں۔

**اسلام جبر و استحصال کا مخالف** اس کے علاوہ اسلام سماجی و تمدنی میدان میں بھی اصلاح کی دعوت دیتے ہوئے جہاں ایک طرف جبر و استحصال کے خلاف علم بلند کرتا ہے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہے تو دوسری طرف وہ انسانی معاشرہ میں پھیلی ہوئی سماجی برائیاں اور ہر قسم کے فتنوں کا بھی سد باب کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ پورا معاشرہ سماجی گندگیوں سے پاک ہو جائے اور تمام لوگ ایک خدائے برتر کی مکمل اطاعت کرتے ہوئے دونوں جہانوں کی سعادتوں سے متمتع ہو سکیں۔

اس لحاظ سے تمام انسانوں کا حاکم اعلیٰ صرف باری تعالیٰ ہے اور اس کے حکم پر کسی دوسرے کا حکم چل نہیں سکتا۔ کیونکہ تمام انسانوں کا خالق و معبود ہونے کی حیثیت سے اس کائنات میں اسی کا حکم چل سکتا ہے اور تمام لوگ اس کے حکم کے پابند ہیں:

| | |
|---|---|
| إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف: ۴۰) | حکم کرنا اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے چنانچہ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ |

یہ وہ پروانۂ ربانی ہے جو قوموں کو قوموں کے جور و ستم، جبر و استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے نجات دلاتے ہوئے سب کو خدائی حکم اور اس کی اطاعت کا پابند بناتا ہے چنانچہ اسلامی قانون کی رو سے کوئی قوم دوسری قوم پر اور اسی طرح کوئی انسان دوسرے انسان پر اپنی من مانی نہیں چلا سکتا یا دوسروں کے حقوق غصب نہیں کر سکتا، بلکہ اسے ہر حال میں خدائی احکام کی پابندی کرنی ہوگی۔ جو ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے۔

**منکرات و فواحش کی روک تھام** اب جہاں تک اخلاقی و سماجی برائیوں کا تعلق ہے تو اسلام ہر قسم کے فواحش اور بے حیائی کے کاموں پر روک لگاتا ہے تاکہ انسانوں کے اخلاق



و عادات بگڑنے نہ پائیں اور وہ نرے حیوان بن کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ حسب ذیل آیت کریمہ قرآن حکیم کی ایک جامع ترین آیت ہے، جس میں سماجی انصاف اور انسانوں کے باہمی حقوق کی ادائیگی اور احسان کا مظاہرہ کرنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی اخلاقی و سماجی برائیوں سے اجتناب کرنے پر زور دیا گیا ہے:

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (نحل: ۹۰) | اللہ تم کو حکم دیتا ہے ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنے، حسن سلوک کا برتاؤ کرنے اور رشتہ داروں کو نوازنے کا اور وہ تم کو منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں، عمومی برائیوں اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے سے۔ |

**ایک مثالی معاشرہ** اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں سے روکا گیا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو سماج کی اصلاح و پاکیزگی کی بنیاد ہیں اور ان پر عمل کرنے کے بعد ہی کوئی معاشرہ مثالی یا آئیڈیل بن سکتا ہے۔ ان احکام کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ سماجی و معاشرتی اصلاح کے بارے میں اسلام کا مزاج کیا ہے اور وہ کس قسم کی اصلاحات لانا چاہتا ہے۔ بہرحال جب تک منکرات و فواحش کی روک تھام نہ ہو انسانیت کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لئے "محکمہ" "احتساب" ضروری ہے۔ مگر اسلام نے ہر مسلمان پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ جہاں کہیں کوئی "برائی" دیکھے اسے ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کرے چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے:

"تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی طاقت

نہ ہو تو پھر زبان سے اس کی مذمت کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔" (مسلم ۱/ ۶۹)

ایک اسلامی حکومت میں اس قسم کی سماجی برائیوں کی روک تھام کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے اور یہ فریضہ افراد امت پر بھی عائد ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں مذکور ہے: "تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" اور اس دوطرفہ عمل ہی کے باعث ایک مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

**اسلامی حکومت کا ایک فریضہ** اوپر مذکور آیت کریمہ میں لفظ "فحشاء" کا اطلاق فحش کام اور فحش گوئی پر ہوتا ہے اور اس سے مراد زناکاری ہے اور لفظ "منکر" وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں ہر قسم کے گناہ، برائیاں اور برے کام شامل ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۶۷)

لوگوں کو معروف کا حکم کرنا اور منکرات کی روک تھام کرنا اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

| | |
|---|---|
| إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (حج: ۴۱) | (وہ لوگ) جن کو ہم زمین میں اقتدار پر فائز کر دیں تو وہ نماز کو قائم کرنے والے، زکوٰۃ ادا کرنے والے، معروف (اچھائیوں) کا حکم کرنے والے اور منکر (برائیوں) کی روک تھام کرنے والے ہوں گے۔ |

ایک حدیث میں مذکور ہے کہ: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا تو تم (لوگوں کو) معروف کا حکم کرتے اور منکر سے روکتے ہو گے، یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر



کوئی عذاب مسلط کر دے۔ پھر اگر تم دعا بھی کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے: جس قوم میں گناہ کے کام ہو رہے ہوں اور اس میں ان گناہوں کو روکنے پر قدرت رکھنے والے بھی موجود ہوں مگر پھر بھی وہ نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ (ابوداؤد: ۴/ ۵۱۰)

**ظلم و عدوان کے خلاف جہاد** منکرات میں ظلم و عدوان بھی شامل ہے۔ یعنی کسی معاملے میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا، یا کسی کا مال و جائیداد وغیرہ ہڑپ کر لینا یا کسی کو ستانا اور نقصان پہنچانا یا قتل و غارت گری کرنا وغیرہ۔ تو ایسے موقعوں پر ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ظلم سے روکنا اصلاح معاشرہ کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک حدیث اس طرح وارد ہوئی ہے:

"اللہ کی قسم تم معروف کا حکم ضرور کرو گے اور منکر سے ضرور روکو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کی طرف لوٹاؤ گے اور اسے حق پر قائم رکھو گے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے۔ (ایضاً: ۴/ ۵۱۴)

اس اعتبار سے ظلم کا قلع قمع کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں قومیت وطنیت اور نسل پرستی وغیرہ کے سلسلے میں جو ظلم و زیادتی اور جور و ستم مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان برپا ہو رہے ہیں ان سب کو مٹانا اور جبر و استحصال سے دنیا کو نجات دلانا اسلامی حکومتوں کے فرائض میں داخل ہے، بشرطیکہ وہ قوت و شوکت کے لحاظ سے اس مرتبے پر فائز ہو جائیں۔ جس طرح کہ آج امریکہ نیو ورلڈ آرڈر نافذ کرتے ہوئے اپنے حساب سے دنیا میں "امن" قائم کرنے کے درپے ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محض اپنی قوت و شوکت کے

بل بوتے پر "تھانیدار" بن کر اپنے باطل اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ایسا کر رہا ہے جب کہ وہ اقدار کے لحاظ سے درجۂ صفر پر ہے اور اس کا یہ اقدام بھی "ظلم" و زیادتی پر مبنی ہے۔ لہٰذا اگر مسلم ممالک کو اپنی قوت و طاقت حاصل ہو جائے تو وہ قیام "عدل" کی غرض سے ایسا ضرور کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے مسلم ممالک کو یہ چیلنج ضرور قبول کرنا چاہئے اور کچھ کر دکھانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اور یہ موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ۔ (انفال: ۶۰) اور تم ان کے مقابلے کے لئے جس قدر قوت تیار کر سکتے ہو کرو۔

**اسلامی تعلیمات کا خلاصہ** اوپر مذکورہ اسلامی تعلیمات اور اس کی خصوصیات کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ اسلام انسانی مساوات کا علم بردار اور تمام انسانوں کا نجات دہندہ ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر خالق کائنات کا بندہ بنانا اور اسے اخروی سعادتوں سے مالا مال کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ اسلام پُرامن تبلیغ کا قائل اور زور و زبردستی کا مخالف ہے۔ وہ لوگوں کو غور و فکر کا موقع فراہم کرتے ہوئے عقل سے کام لینے اور آنے والی زندگی کی فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

۳۔ اسلام ہر قسم کے قومی، گروہی، طبقاتی جبر و استحصال کا خاتمہ کر کے نوع انسانی کو صرف احکام الٰہی کا پابند بنائے رکھنا چاہتا ہے۔

۴۔ اسلام دنیا سے ہر قسم کے فواحش اور سماجی برائیوں کا سدباب کر کے انسانی معاشرے کو گندگیوں سے پاک کرنا اور روحانیت کا مرتبہ بلند کرنا چاہتا ہے۔



۵۔ اسلام ہر قسم کے قومی اور بین الاقوامی جبر و استحصال اور ظلم و عدوان کا خاتمہ کر کے پورے عالم انسانی کو ایک مثالی معاشرہ کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔

**مغرب نے انسانیت کو کیا دیا؟** اسلام کی ان صاف و شفاف اور حقیقت پسندانہ تعلیمات کے برعکس مغربی تہذیب انسانیت کو سوائے الحاد و لادینیت یا بے خدائی کے کچھ نہ دے سکی، جس کے نتیجے میں کام و دہن کی لذت، عیاشی، عریانی اور بے حیائی کا ایک سیلاب سا آگیا ہے اور تمام انسانی قدریں پامال ہو کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ آج مغربی قومیں "خدا" سے بے نیاز یا اس کی باغی بن کر ننگا ناچ ناچ رہی ہیں اور ہر قسم کے فواحش و منکرات کو اپنے لئے جائز قرار دے کر تمام دینی و اخلاقی حدود و قیود سے تجاوز کر چکی ہیں اور یہی سارے "تحفے" وہ عالم انسانیت کو دے کر اس کی آخرت کو بھی تباہ و برباد کر دینا چاہتی ہیں اور دوسری طرف وہ کمزور قوموں کا استحصال کرتے ہوئے انہیں لوٹنا اور ان کا خون چوس کر اپنی عیاشی کو فروغ دینا چاہتی ہیں۔ اسی لئے آج "نیو ورلڈ آرڈر" اور "گلوبلزم" کے نام سے مغربی قومیں مشرقی قوموں کو پھانسنا اور اپنی بے خدا تہذیب ان پر مسلط کر کے پوری دنیا کو ایک جہنم بنا دینا چاہتی ہیں۔ لہٰذا آج انسان کو پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ آیا اس کی نجات اسلام میں ہے یا مغربی تہذیب میں؟ یہ پوری نوع انسانی کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

مغرب کی سب سے بڑی دین سائنس کو سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بھی اس کا کارنامہ نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سائنسی تعلیمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا۔

**قرآن کی سائنسی تعلیمات** قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے، مگر اس کے باوجود اس میں ایسے بے شمار احکام و ہدایات موجود ہیں جو سائنسی میدان سے تعلق رکھتے ہیں۔

سائنسی علوم و مباحث کا تعلق چونکہ "تمدن" سے ہے جو دین ابدی کا ایک بازو ہے، اس لئے اسلام نے اس سلسلے میں جامع ہدایات دی ہیں۔ اس اعتبار سے دین ابدی کے دو بازو ہیں: ایک شریعت اور دوسرے تمدن اور ان دونوں میں توازن قائم کرنے کے بعد ہی کوئی دین اپنے "کامل" ہونے کا دعوی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب الٰہی میں شرعی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو ایسی تمدنی تعلیمات بھی ملتی ہیں جو فکری و نظریاتی اعتبار سے اہل اسلام کو کارزار حیات میں آگے بڑھنے میں مدد دیتی اور خاص کر "خلافت ارض" یا زمین کی جانشینی کے حصول میں معاونت کرتی ہیں۔

**خدا کی معرفت تخلیقات الٰہیہ میں** تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ دو چیزوں میں ہے: (۱) خدا کو پہچاننا (۲) اور خدا کے احکام پر عمل کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پہچان ہی کی غرض سے یہ کائنات بنائی ہے اور اس میں انواع و اقسام کی چیزیں پیدا کر کے انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ ان مختلف النوع مخلوقات میں غور و فکر کر کے اپنے "خالق" اور "معبود" کو پہچانے کیونکہ ان مخلوقات اور ان کی ساخت و پرداخت میں اللہ تعالیٰ کی "ربوبیت" یا اس کی کارسازی کے دلائل رکھ دئے گئے ہیں جو ان کی "خلقت" یا ان کے اندرونی "نظام" کا جائزہ لینے کے بعد کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کی اولین وحی میں "تخلیقات الٰہیہ" کے ذریعہ "ربوبیت" کا مطالعہ کرنے اور اپنے "رب" کو پہچاننے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ — پڑھ اپنے رب کے نام سے، جس نے
خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ — (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا اور اس نے
(علق: ۱-۲) — انسان کی تخلیق خون کی پھٹکی سے کی۔



اس میں پہلی آیت تمام خدائی مخلوق سے متعلق ہے اور دوسری آیت کا تعلق خصوصیت کے ساتھ انسان سے ہے، جس میں انسان کو اپنی تخلیق کی ابتدائی حالت سے اپنے مطالعے کا آغاز کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح جب انسان مخلوقات الٰہی میں غور کرے گا تو "تخلیق الٰہی" کی اصل حقیقت اس پر واضح ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے "رب" (کارساز عالم) کو پہچان لے گا اور اس کی عظمت و برتری کے دلائل واضح ہو جائیں گے۔

**مطالعہ کائنات کا حاصل** اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی حقیقت سمجھنے کے لئے خدا کی مخلوقات کا مطالعہ لازمی ہے۔ جب انسان اس حقیقت تک پہنچ جائے تو پھر اسے سارے جہاں میں خالق عالم کی کرشمہ سازیوں کا نظارہ ہونے لگے گا اور اس کائنات کی ساری گتھیاں یا معمے حل ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں اس کی زبان سے اپنے خالق و رب کی حمد و ثنا جاری ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید کی اولین سورت کی اولین آیت میں اسی حقیقت عظمیٰ پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بڑی حقیقت افروز ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — ہر قسم کی تعریف کا مستحق اللہ ہی ہے جو
(سورہ فاتحہ: ۱) — سارے جہاں کا رب (کارساز) ہے۔

یہ مختصر ترین آیت کریمہ جو قرآن حکیم کا سرنامہ ہے، اس سلسلے کے پورے مطالعے کا خلاصہ اور لب لباب ہے اور اس کی تفسیر میں دفتروں کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں، مگر اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

غرض جو انسان خالی الذہن ہو کر اس کائنات کا پوری سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرے گا تو اس پر وجود باری کے نشانات یا "دلائل ربوبیت" پوری طرح واضح ہو جائیں گے اور وہ فکری اعتبار سے کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھائے گا۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ
وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ
(ذاریات : ۲۰-۲۱)

یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں
بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود
تمہاری اپنی ہستیوں (جسمانی نظاموں)
میں بھی کیا تم کو نظر نہیں آتا۔

چنانچہ یہی وہ سب سے بڑا اور اہم مقصد ہے جس کی بنا پر انسان کو مطالعہ کائنات کی
پرزور انداز میں دعوت دی گئی ہے:

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْ خَلْقِكُمْ
وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ
لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔
(جاثیہ : ۲-۳)

زمین اور اجرام سماوی میں ایمان
والوں کے لئے (وجود باری کی) نشانیاں
موجود ہیں اور خود تمہاری خلقت اور
زمین پر پھیلائے ہوئے جانداروں میں
بھی یقین کرنے والوں کے لئے (بہت سی)
نشانیاں (دلائل ربوبیت) موجود ہیں۔

**الحاد پسند لوگوں کی رہنمائی** چنانچہ یہ دونوں آیتیں اوپر مذکور سورۂ علق والی مجمل آیات کی بھی تفسیر و تفصیل کر رہی ہیں لیکن مخلوقات الٰہی یا مظاہر فطرت میں موجود یہ نشانیاں سطحی غور و فکر سے حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے لئے دقت نظر اور عمیق مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں اس قسم کا گہرا مطالعہ سائنسی علوم کے تحت کیا جا رہا ہے اور اس اعتبار سے آج سائنسی علوم کی بڑی اہمیت ہو گئی ہے اور ان علوم میں مہارت حاصل کئے بغیر آج مسلمان مظاہر کائنات میں موجود خدا کے وجود اور اس کی خلاقیت و ربوبیت کی نشانیوں کو اجاگر نہیں کر سکتے اور اس کے نتیجے میں الحاد پسند لوگوں کی صحیح رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آج اہل اسلام کے



ذمہ یہ ایک بہت بڑا دینی و شرعی فریضہ ہے، جسے ہر حال میں انجام دینا ضروری ہے اور اس موضوع پر قرآن حکیم میں بے شمار آیات موجود ہیں جو اس راہ میں کام کرنے والوں کے لئے متعدد حیثیتوں سے رہنمائی کرتی ہیں۔ قرآن حکیم اس حیثیت سے بھی عالم انسانی کے لئے "نامہ ہدایت" ہے جو اس کے اصل موضوع کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا اہل اسلام کو قرآن عظیم کی اس امتیازی خصوصیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری اہل اسلام ہی پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔

**اسلام ترقی تمدن کا داعی** یہ قرآن حکیم کی سائنسی میدان میں ہدایت و رہنمائی کا صرف ایک پہلو ہے جو فکر و نظر یا اعتقادی امور سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دوسرا پہلو تمدنی، عسکری اور سیاسی امور و مسائل سے متعلق ہے اور یہ دوسرا میدان پہلے میدان کو سر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ جب کوئی قوم مظاہر عالم یا اشیائے کائنات میں غور و خوض کرے گی اور ان کے نظام کا تفصیلی جائزہ لے گی تو جہاں ایک طرف ان اشیاء میں موجود وجود باری کی نشانیاں ظاہر ہوں گی تو دوسری طرف ان موجودات میں پائے جانے والے "مادی فوائد" بھی لازمی طور پر منظر عام پر آجائیں گے جو اس میدان میں آگے بڑھنے والی قوم کو تمدنی و عسکری میدان میں "ترقی" کی راہ پر گامزن کر کے اسے "قوت" فراہم کرنے والے ہوں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بطور مثال دو قرآنی آیات ملاحظہ ہوں جو اس میدان کو سر کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔
(جاثیہ : ۱۳)

اس نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں
کو اپنی طرف سے تمہارے قابو میں کر دیا
ہے۔ اس باب میں غور و فکر کرنے والوں
کے لئے بہت سی نشانیاں (دلائل) موجود ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ | اور تم ان کے مقابلے کے لئے جتنی قوت |
| مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ | اور گھوڑوں کے پڑاو تیار کر سکتے ہو |
| تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ | کرو، تاکہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں |
| وَعَدُوَّكُمْ (انفال: ۶۰) | پر ہیبت طاری کرسکو۔ |

**زوال امت کی اصل وجہ** اس اعتبار سے سائنسی امور کے تین میدان ہو گئے (۱) فکری واعتقادی نقطۂ نظر سے مظاہر عالم میں موجود اسباق وبصائر کی تحقیق (۲) مظاہر عالم میں موجود مادی منافع کا حصول (۳) اور ان منافع کے ذریعہ عسکری میدان میں قوت وشوکت حاصل کرنا۔ ان سے بڑھ کر واضح آیات واحکام اور کیا ہو سکتے ہیں؟ مگر اہل اسلام نے آج قرآن عظیم کو صرف "کتاب شریعت" قرار دے کر اس کی فکری، سائنسی، تمدنی اور عسکری تعلیمات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کتاب الٰہی میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اس کا کھلا ہوا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ غیر قومیں تو اس میدان کو سر کر کے آگے بڑھ گئیں اور مسلم قومیں زوال وانحطاط کے آخری سرے پر پہنچ کر تمدنی وعسکری میدان میں ترقی یافتہ قوموں کی غلام یا ان کی حاشیہ بردار بن کر رہ گئیں اور اس لحاظ سے آج مسلمان سائنسی میدان میں کیا پیچھے ہوئے، فکری واعتقادی اور تمدنی وعسکری دونوں میدانوں میں پس ماندہ بن کر سیاسی اعتبار سے بھی اپنا وزن کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج روئے زمین پر پچاس سے زیادہ مسلم حکومتیں پائی جانے کے باوجود سیاسی حیثیت سے ان کا کوئی وزن ہی نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ مغربی قومیں انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہی ہیں۔ حالانکہ دین اسلام نے ہمیں اول ہی دن سے ان میدانوں کو سر کرنے کی پرزور تاکید کی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کے موجودہ زوال اور پستی میں اسلام کا کوئی قصور نہیں، بلکہ قصور ہمارا اپنا ہے۔



**قرآن کتاب خلافت بھی ہے** اور یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ ہم کار خلافت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے جدید علوم ومسائل سے چھوت چھات برتتے رہیں گے۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی ہماری آبائی میراث ہیں جن کو قرون وسطی کے مسلمانوں نے ترقی دی تھی۔ اور انہیں اس میدان میں آگے بڑھانے والا قرآن عظیم ہے، جس میں نظام کائنات سے متعلق ساڑھے سات سو آیات موجود ہیں اور ان میں سے صرف چند آیات پچھلے صفحات میں پیش کی گئی ہیں اور اس اعتبار سے قرآن عظیم صرف "کتاب شریعت" ہی نہیں بلکہ وہ "کتاب تمدن" اور "کتاب خلافت" بھی ہے۔ لہٰذا آج اگر مسلمانوں کو اپنی موجودہ پستی سے باہر نکلنا ہے تو قرآن عظیم کے تمدنی احکام وہدایات پر کان دھرنا اور خلافت کے میدان میں آگے بڑھنا پڑے گا اور یہ فریضہ آج علما اور امت کے عمائد دونوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ افراد امت کو قرآنی ہدایات کے مطابق کار خلافت کے لئے تیار کریں۔

**خیر امت کا فریضہ** حاصل یہ کہ ہم موجودہ حالات میں جدید علوم ومسائل یا جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے چھوت چھات نہیں برت سکتے، ورنہ ہم پوری دنیا سے کٹ کے رہ جائیں گے اور خود شرعی نقطہ نظر سے بھی ایسا کرنا ہمارے لئے جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ بحر وبر کی ساری نعمتیں اور سارے وسائل اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی لئے مسخر کر رکھے ہیں جو قوانین فطرت کے تحت جاری وساری ہیں لہٰذا ہمیں خلافت کے میدان میں دوسری قوموں سے مسابقت کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کر کے نہ صرف خود کو طاقتور بنا سکیں بلکہ اس میدان میں آگے بڑھ کر ایک طرف علمی واستدلالی نقطہ نظر سے الحاد ولادینیت کا مقابلہ کر سکیں تو دوسری طرف اسلامی عدل وانصاف بھی قائم کر کے ظلم وعدوان کو مٹا سکیں، تاکہ اس مظاہرے کے ذریعے دنیا میں امن وامان اور چین وسکون حاصل ہو سکے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک

"بہترین" امت بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو خیر یا "معروف" کی دعوت دیتے ہوئے "منکرات" کی روک تھام کرسکیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو عالم انسانی (کی اصلاح) کے لئے بھیجی گئی ہے۔ (لہذا تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اسے (عقلی حیثیت سے) معروف (جانی پہچانی بات) کی تلقین کرو اور اسے منکر (غیر جانی پہچانی بات) سے روکو۔

اس آیت کریمہ میں معروف اور منکر دو ایسی اصطلاحیں ہیں جو وسیع مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ معروف میں عقلی و شرعی تمام اقدار اور اچھائیاں داخل ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح منکر میں وہ تمام برائیاں شامل ہوسکتی ہیں جو عقلی و شرعی دونوں حیثیتوں سے نوع انسانی کے لئے مضر اور ہلاکت خیز ہوں اور اس میں وہ مہلک ہتھیار بھی داخل ہیں جو پوری پوری آبادیوں کو آن کی آن میں موت کی نیند سُلا دینے والے ہوں۔

**موجودہ دور کا فتویٰ** غرض تہذیب جدید کی ہلاکت خیزیوں اور اس کے تباہ کن ہتھیاروں سے نوع انسانی کو بچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور یہ فریضہ آج مسلمان ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ شریعت مطہرہ نے ان پر اسے ایک قومی و ملی فریضے کے طور پر عائد کیا ہے۔ مگر اس مقصد کے لئے انہیں قوت و طاقت بھی حاصل کرنا ضروری ہے جو آج سائنس و ٹکنالوجی میں ترقی کی بدولت ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ اس اعتبار سے سائنس اور ٹکنالوجی کا حصول ہمارے تمام قومی و ملی "امراض" کا واحد علاج ہے اور اسے شرعی اعتبار سے موجودہ



دور کا "فتویٰ" قرار دیا جاسکتا ہے اور راقم السطور ایک عالم دین ہونے کی حیثیت سے آج یہ فتویٰ صادر کرتا ہے کہ مسلمان دنیا کی "امامت" دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے اس میدان کو سر کریں جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی میراث ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا تھا اور اس مقصد کے لئے آپ کو "علم الاسماء" یا علم الاشیاء کا تحفہ عنایت فرمایا تھا (دیکھئے بقرہ: ۳۱) تاکہ وہ اس علم کی مدد سے زمین کی خلافت پر فائز ہوسکیں۔ یہی وہ علم الاشیاء ہے جو موجودہ دور میں "سائنس" کہلاتا ہے۔ لہذا سائنس اور "خلافت ارض" میں چولی دامن کا ساتھ ہے جو قوم اس علم سے غافل رہے گی وہ دنیا میں ہمیشہ مغلوب یا دیگر قوموں کی غلام بن کر رہے گی اور یہ نوشتہ تقدیر ہے۔

---

## جمع و تدوین قرآن

سید صدیق حسن صاحب مرحوم

اس کتاب میں قرآن کے رسم الخط کی حفاظت، صحابۂ کرام اور ان کے مصاحف کی ترتیب، عہد نبوی میں قرآن پاک کی تدوین، کتابت قرآن کی صورت یعنی قرآن مجید کے جمع و تدوین کی تاریخ پر ایک محققانہ بحث جس میں عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن، رسالت مآبؐ کے عہد بابرکت ہی میں مدون اور مکمل ہوگیا تھا۔ قیمت ۲۰ روپے۔

## تعلیم القرآن

مولفہ محمد اویس ندوی

یہ رسالہ جناب مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جس میں مسلمان بچوں کی بنیادی مذہبی تعلیم کے لئے عام فہم اور دلنشیں انداز میں قرآن کی دینی و اخلاقی تعلیمات لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے۔

# تحریک مجاہدین اور اردو شاعری

از ڈاکٹر مظفر مہدی صاحب٭

برصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں تحریک مجاہدین، یا "وہابی تحریک" اپنی تحریکی قوت، تنظیمی صلاحیت، عوامی مقبولیت، ایثار و قربانی، جذبہ جہاد و عمل اور دور رس اثرات کے لحاظ سے ایک انتہائی اہم تحریک رہی ہے۔ یہ تحریک بیک وقت مذہبی بھی تھی۔ سیاسی بھی اور سماجی بھی[1] یہاں یہ واضح رہے کہ اسلام میں مذہب و سیاست کی تفریق کا کوئی تصور نہیں اور اگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا گیا تو اقبال کے لفظوں میں ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تحریک مجاہدین کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب اپنے مشن کا آغاز کیا تھا تو اس وقت ملت اسلامیہ ہند کے حالات نہایت زبوں تھے۔ سماجی خرابیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی اقدار بھی پارہ پارہ ہو رہی تھیں۔ شرک و بدعات کا شدید غلبہ تھا۔ ہندوانہ رسمیں مسلمانوں کی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔ نکاح بیوگان ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف مسلم معاشرت کی پراگندگی کا یہ حال تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مظالم کا نشانہ بننا پڑ رہا تھا اور مذہبی اصولوں پر چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ مولانا جعفر تھانیسری کا بیان ہے کہ "باآواز بلند اذان کہنا اور گاؤکشی جرائم کبیرہ میں داخل تھی"[2]

[1] اپنی تلاش میں، کلیم الدین احمد ص ۱۶۴ [2] ایضاً۔

٭ شعبۂ اردو، ایم۔ آر۔ ایم کالج، دربھنگہ۔



گویا ملک کے حالات اتنے سنگین اور ابتر ہو گئے تھے[1] کہ ایک تجزیہ کے مطابق:

"زمانہ اس کا منتظر تھا اگر سید احمد شہیدؒ نہ ہوتے تو کوئی دوسرا سید احمد زمانہ پیدا کر دیتا"

تحریک مجاہدین نہ صرف احیائے اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے نیز اصلاح معاشرہ کے لئے انقلابی اقدام کی حامی تھی بلکہ اس کے قیام کا مقصد آزادی کی بازیابی بھی تھی[2] یہاں یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تحریک مجاہدین کا فکری رشتہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی فکر سے بہت گہرا رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس تحریک نے ولی اللّٰہی فکر کے بطن سے ہی جنم لیا تھا۔ ڈاکٹر قیام الدین نے تحریک مجاہدین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ہندوستان کی وہابی تحریک جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیمات سے ہوئی۔ ان کی اولاد اور ان کے شاگردوں نے اس درخت کی آبیاری کی اور حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی اور حضرت اسماعیل شہید اور ان کے جاں نثار رفیقوں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ یہ ایک عوامی سیاسی تحریک تھی اور یقیناً پہلی عوامی تحریک تھی"[3]

غرض یہ تحریک ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے اور مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلانے کی سب سے پہلی اور منظم کوشش تھی۔ اس سے قبل "غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے اور احیائے ملی کے لئے ہندوستان میں اس سے زیادہ منظم اور پرجوش کوشش نہیں ہوئی تھی"[4]

مگر عام طور پر انگریز مصنفین نے اور ان کی تقلید میں بعض ہندوستانی مورخین نے

[1] اپنی تلاش میں کلیم الدین احمد ص ۱۶۳ [2] ہندوستان میں وہابی تحریک۔ ڈاکٹر قیام الدین احمد مترجم مسلم عظیم آبادی [3] ایضاً [4] سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ نور الحسن نقوی مقدمہ خلیق احمد نظامی۔

اس تحریک کے سلسلے میں یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ہندو مخالف تحریک تھی جو دراصل حقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے، کیونکہ بعض اوقات خود ہندوؤں نے بھی اس تحریک کی مدد کی تھی[1] اس تحریک کی صحیح تصویر سید احمد شہیدؒ کے اس خط سے نمایاں ہوتی ہے جو انہوں نے مہاراجہ دولت سندھیا کو لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو:

"اجنبی قوم دور دراز ملکوں سے آکر ہندوستان پر قابض ہوگئی اور جو تاجر تجارت کے بہانے سے آئے تھے وہ بادشاہ بن بیٹھے ہیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ جیسے ہی ہندوستان کی سرزمین ان اجنبی دشمنوں سے پاک و صاف ہو جائے گی اور جیسے ہی ہم لوگوں کا مقصد پورا ہو جائے گا تو ہم لوگ زمام حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیں گے جو اس کے خواہاں ہیں۔"[2]

اس خط سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ اس تحریک کے پیش نظر اصل مقاصد کیا تھے۔ تحریک مجاہدین کی عوامی مقبولیت اور اس کی سرگرمی کا دائرہ اس قدر وسیع اور اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ بقول کے۔ ایم۔ اشرف:

"احیائے اسلام کی تحریک ان وہابی رہنماؤں کی اولین کوششوں کی رہین منت ہے جس سے انگریزی کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا، اس محاذ میں سبھی شامل تھے۔ جائدادوں سے محروم افراد تباہ حال دستکار ناکام و نامراد علماء اور غیر مطمئن فوجی یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا، بقول ڈاکٹر ہنٹر ان کا نظام واقعی ایک بے قرار آبادی کی امید و بیم کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔"[3]

[1] اپنی تلاش میں۔ کلیم الدین احمد ص ۱۷۱ [2] انقلاب اٹھارہ سو ستاون مرتبہ پی سی جوشی ص ۹۲ [3] ایضاً۔



اب ظاہر ہے کہ جو تحریک اتنی مقبول عام۔ اس قدر منظم، ہمہ گیر اور اعلیٰ نصب العین کے تحت وجود میں آئی ہو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وقت کے مدبر و مفکر علماء۔ ادباء اور شعراء اس کے دائرۂ اثر سے اپنا دامن بچالے جاتے۔ چنانچہ متعدد شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک نے اپنی مدت حیات میں اور اس کے بعد بھی چوٹی کے مفکر و مدبر اور ادباء و شعراء کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کی فکر کو بلیغ بنا دیا اور ان کی آبیاری میں زبردست حصہ لیا، اس ضمن میں فوری طور پر جو چند نام پیش کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں: حضرت مولانا عبدالحیؒ، مولانا مملوک علی، مفتی صدر الدین آزردہ۔ سر سید احمد خاں۔ مولانا قاسم نانوتویؒ، جمال الدین افغانی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہؒ، غالب، مومن، آتش، ذوق، حالی۔ شاہ نصیر۔ جنرل بخت خاں، اقبال، حافظ محمود خاں شیرانی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔

سر سید احمد خاں کی شخصیت اور ان کی فکر پر حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہیدؒ کی انقلابی شخصیت اور ان کی تعلیمات کا بڑا ہی گہرا اثر پڑا تھا اور کیوں نہ پڑتا جب کہ خانوادۂ سید احمد شہید کے زیر اثر ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی۔ سر سید احمد خاں پر تحریک مجاہدین کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کے۔ ایم۔ اشرف رقم طراز ہیں:

"سر سید احمد خاں جب دہلی کے بلند مرتبہ اشخاص کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہیں تو وہ اس میں نہ صرف وہابی رہنماؤں کو شامل کرتے ہیں بلکہ وہابیوں کی دعوت جہاد کے مذہبی تقدس کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں...... سر سید احمد خاں" احکام محمدی کی اطاعت" کرنے والوں کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور "جہاد" کو انتہائی دینی تقدس کا فعل تصور کرتے ہیں۔"[1]

[1] "انقلاب اٹھارہ سو ستاون" مرتبہ پی سی جوشی ص ۹۳۔

سر سید احمد خاں کے رفیق خاص مولانا حالی بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سر سید کے یہاں جو آزادی خیال اور جرأت گفتار ہے اس کا سر چشمہ بھی دراصل مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔[۱]

جمال الدین افغانی کی عظیم شخصیت بھی تحریک مجاہدین کے اثر سے نہ بچ سکی تھی۔ کیونکہ ان کی دینی تعلیم برصغیر ہند و پاک میں ہوئی۔۔۔ ان کے زمانہ تعلیم میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی بازگشت بھی موجود تھی اور تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اثرات بھی سامنے تھے۔ ان حالات و حوادث سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ لہٰذا وہ برصغیر ہندوستان سے انقلابی ذہن لے کر نکلے۔

مولوی احمد اللہ اور مولوی فضل حق خیر آبادی کی شخصیتیں ہماری ملی اور سیاسی تاریخ میں زبردست اہمیت کی حامل ہیں۔ مولوی احمد اللہ گو باضابطہ تحریک مجاہدین سے وابستہ نہ تھے مگر وہ احیائے اسلام کے پُر زور حامی تھے۔ بقول کے۔ ایم۔ اشرف "وہ احمد اللہ، سید احمد بریلوی کے پیروؤں اور وہابیوں کی جماعت کے ساتھ پورے طور پر تعاون کر رہا تھا۔[۲]

مولوی فضل حق خیر آبادی تحریک مجاہدین کے بڑے مخالف تھے مگر انگریزوں کی مخالفت میں وہ مجاہدین کی کاوشوں کو سراہتے تھے۔ کے۔ ایم اشرف رقم طراز ہیں:

"یہ کہنا بجا ہوگا کہ فضل حق خیر آبادی ۱۸۵۷ء کے مسلمانوں کی روح تھے۔ اگرچہ اصطلاحاً وہ خود وہابی نہ تھے بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالف تھے پھر بھی انہوں نے استقلال کے ساتھ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔[۱]

جنرل بخت خاں ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کو گروہ مجاہدین سے گہری عقیدت ہی نہ تھی بلکہ یہ ہر اعتبار سے ایک کٹر اور متعصب وہابی تھا۔[۲]

مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کی شخصیت کی نشو و نما بھی اسی تحریک کے آب و گل میں ہوئی تھی، وہ ایک مجاہد خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد شہید کے ساتھ شریک جہاد تھے اور ان سے نسبت ارادت بھی رکھتے تھے۔[۳] مزید یہ کہ تحریک سید احمد شہید کا ٹونک سے ایک خاص تعلق بھی رہا ہے۔ جہاں سید صاحب کے خاندان کی ایک شاخ آباد ہو گئی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر بھی وہابی تحریک کا اثر رہا ہے کیونکہ حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی تحریک کے رکن مولانا آزاد بھی تھے اور اس تحریک کا سلسلہ نسبت تحریک مجاہدین سے ملتا ہے۔[۴]

اس تفصیل سے اس تحریک کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات کا اندازہ ہوا ہوگا، اب آئیے دیکھیں کہ اس کے اثرات زبان و ادب پر کیا پڑے، پہلے ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ اردو نثر کو اس تحریک کی کیا دین ہے۔ دراصل اردو نثر کو فروغ دینے اور اسے ملک گیر شہرت و مقبولیت عطا کرنے میں وہابی تحریک کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بقول پروفیسر کلیم الدین احمد: "وہابی تحریک کا ایک اور کارنامہ ہوا جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا اور وہ اردو نثر کو نثر بنانا۔ اسے ترقی دینا۔ اس کی ترویج کرنا۔ وہابیوں کا اہم کام تھا۔[۵]

---

۱ بحوالہ اردو میں وہابی تحریک، خواجہ احمد فاروقی ص ۴۰ ۲ انقلاب اٹھارہ سو ستاون ص ۹۹۔

---

۱ انقلاب اٹھارہ سو ستاون ص ۱۰۵ ۲ ایضاً ص ۱۰۰ ۳ ہماری زبان دہلی ۸ دسمبر ۱۹۸۵ء ۴ سوونیر مدرسہ اسلامیہ رانچی بہ یادگار مولانا ابوالکلام آزاد ص ۹ ۵ اپنی تلاش میں ص ۱۹۰۔

لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ جب جدید اردو نثر کا ارتقائی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج، غالب اور سر سید کی نثری خدمات کا ذکر تو ہوتا ہے لیکن تحریک مجاہدین کی نثری خدمات سے اغماض برتا جاتا ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر لکھے گئے رسالوں اور تصانیف کے باعث اردو نثر کے اسلوب اور مزاج میں انقلاب انگیز تبدیلی آئی اور سادہ اور آسان نثر کا آغاز ہوا جسے آگے چل کر عوامی مقبولیت ملی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ

"وہابیوں کی عسکری شکست کے باوجود ان کا اسلوب تحریر خاصا مقبول رہا ہے، اس لئے کہ اس کی سرحدیں مستقبل سے مل گئی ہیں۔ یہ خیال کہ عوام تک پہنچانے کے لئے سادہ اور آسان طرز کی ابتدا سر سید احمد خاں نے کی تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں وہابی ادب کو موجودہ اردو نثر کے ارتقا میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو دہلی کالج کی نثر اور سر سید احمد خاں کی تصانیف معرض وجود میں نہ آتیں، میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ سادہ اور آسان نثر انگریزوں کی دین نہیں جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی وہابی مصنفین کی بدولت ہو چکی تھی"[1]

مشہور مصنف ڈاکٹر سید عابد حسین بھی اس دور کے تراجم قرآن اور سر سید احمد تحریک کے رسائل کی اشاعت کو جدید اردو نثر کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں[2]

حضرت سید احمد شہیدؒ کے رفقائے تحریک میں حضرت اسماعیل شہید بڑی اہمیت کے حامل شخص تھے۔ وہ اپنے پیر و مرشد کے تمام معاملات ہی میں دخیل نہ تھے بلکہ اردو نثر کی بھی

[1] اردو میں وہابی ادب ص ۳۸ [2] بحوالہ اردو ادب کی تحریکیں۔ انور سدید ص ۲۸۹۔



اہم ترین خدمات انجام دیں، کئی اہم کتابیں لکھیں جن میں "تقویت الایمان" بہت مشہور ہے۔ اردو نثر کی تاریخ میں یہ کتاب جدید اردو نثر کی نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ شیخ محمد اکرم رقم طراز ہیں۔

"..... ان کی اہم ترین کتاب تقویۃ الایمان ہے جو انہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو گھٹنوں چلنا نہ آتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب کہ اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے"[1]

تحریک مجاہدین میں علمائے صادق پور بھی بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہاں کے بزرگوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اردو نثر کی ترقی و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے، ڈاکٹر اختر اورینوی کے الفاظ میں:

"علمائے صادق پور نے بھی اردو نثر کی تخلیق میں بہت بڑا حصہ لیا ہے ......
علمائے صادق پور نے بھی اپنے مذہبی رسالے اردو ہی میں لکھے، نیز حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید کے مواعظ اور تفاسیر کے نکتوں کو اردو میں منتقل کیا۔ اردو ادب کو صادق پوری تحریک سے بیش بہا فائدہ پہنچا"[2]

ان کا یہ خیال بھی بالکل بجا ہے کہ:

"در اصل جدید اردو نثر کی تاریخ حلقۂ سر سید احمد خاں سے نہیں شروع ہوتی بلکہ دائرۂ سید احمد بریلوی سے اس کا آغاز ہوتا ہے"

جہاں تک اس تحریک کے زیر اثر شاعری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ہمیں اس کا خیال

[1] موج کوثر۔ شیخ محمد اکرام ص ۳۶ [2] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۳۸۶۔

دکھنا ہوگا کہ تحریک مجاہدین کے بزرگوں کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا اور ان کی ساری تگ و دو کا مرکز و محور ملک و ملت کی فلاح و بہبود تھا۔ نیز ان کے شب و روز میدان جہاد اور احیائے ملی میں گزر رہے تھے، اس لئے شعر و شاعری کے لئے جو فرصت و فراغت درکار ہوتی ہے وہ ان مجاہدین کو نصیب نہیں تھی۔ دوسری بڑی وجہ میری ناچیز رائے میں یہ ہوئی کہ ہمارے محققین و ناقدین نے اس طرف کماحقہ توجہ نہیں دی اور یہ تصور کر لیا گیا کہ اس تحریک نے "مجلسی زندگی کے شعراء کو سرے سے متاثر ہی نہیں کیا اور یہ کہہ کر اطمینان کر لیا گیا کہ اردو ادب کے آغاز کے وقت نظم میں عجمیت اور ہندیت کے اثرات زیادہ گہرے پڑے ہیں اور نثر میں اسلامی اثرات زیادہ۔[۱]

اس خیال میں اس حد تک صداقت ضرور ہے مگر اردو کی ابتدائی شاعری اسلامی اثرات سے خالی بھی نہیں ہے۔ اس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ یہاں یہ دکھانا ہے کہ گروہِ مجاہدین میں جو لوگ اصلاح و جہاد کے علاوہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کے کام میں بھی مشغول تھے۔ انہوں نے شاعری سے بھی کسی حد تک دلچسپی لی ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں نے اپنی شاعری میں تحریک کے مقاصد کو بنیاد بنایا ہے اور اپنے پیر و مرشد سے اظہار عقیدت بھی کیا ہے، خود تحریک کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ بھی شعری ذوق رکھتے تھے اور بسا اوقات شعر بھی پڑھا کرتے تھے[۲] اور اپنے مریدوں کو بھی اردو میں لکھنے اور شعر کہنے کی طرف راغب کرتے تھے[۳] حضرت اسماعیل شہیدؒ کا ذکر نثر کے ضمن میں آچکا ہے، ان کو بھی شاعری کا اچھا ذوق تھا اور بسا اوقات شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کی کچھ منظومات فارسی میں ملتی

۱؎ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ص ۳۸۶ ۲؎ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۲۳۹ ۳؎ ایضاً۔



ہیں۔ ایک نعتیہ قصیدہ اور اپنے پیر و مرشد کی مدح میں ایک قصیدہ کے علاوہ ایک مثنوی "سلک نور" کے نام سے یادگار چھوڑی ہے[۱] اس مثنوی کا خاص موضوع شرک کی مخالفت اور عقیدہ توحید کی حمایت ہے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

الٰہی ترا نام کیا خوب ہے — کہ ہر جان کو تو ہی مطلوب ہے
زباں کس طرح حمد تیری کرے — کہ ہے تو تو ادراک ہی سے پرے
ہمیں بس یہی تیرا ادراک ہے — کہ بے شک تو ہر عیب سے پاک ہے
فلک اس کے سجدے میں ہے واژگوں — ملک اس کی تسبیح میں سرنگوں
اسی کی ہیں خدمت میں شمس و قمر — شب و روز حاضر ہیں بستہ کمر
یہ توحید ہے وہ شراب طہور — کہ اک دم میں لائیں ہزاروں سرور
ولے جام کو صاف رکھ شرک سے — دل اپنے کو تو پاک رکھ شرک سے
یہاں تک کر واس کی تم شست و شو — کہ ہرگز نہ باقی رہے اس کی بو
کہ جس دل میں کچھ شرک مستور ہے — سو توحید اس سے بہت دور ہے[۲]

تحریک مجاہدین کے بزرگوں میں مولانا خرم علی بلہوری اور قاضی علاء الدین بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ تصنیف و تالیف سے جڑے رہنے کے باوجود تحریک کے مقاصد کے تحت وقتاً فوقتاً شاعری بھی کر لیا کرتے تھے۔ مولانا خرم علی نے تحریکی مقاصد کے پیش نظر کئی کتابیں لکھیں نیز ترجمے کے فرائض بھی انجام دئے اور ایک "جہادیہ" رزمیہ مثنوی بھی یادگار چھوڑی ہے[۳] اس نظم میں جہاد کی فضیلت بیان کر کے میدان جنگ میں جہادیوں کا جوش و حوصلہ بڑھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۱؎ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۲۹ ۲؎ ایضاً ۳؎ بحوالہ اردو میں وہابی ادب۔

فرض ہے تم پر مسلمانو جہاد کفار     اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
جس کے پیروں پہ پڑے گرد صف جنگ جہاد     وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر     روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبی جہاد     چلو اب اس کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے     غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے     اپنی سستی کا بجز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑ دیا دو     وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

اور آخر میں شاعر خدا سے یوں دعا گو ہے ۔

اے خداوند سماوات و زمیں رب عباد     اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد
اپنا دے زور مسلمانوں کو زور آور کر     وعدۂ فتح جو ہے ان سے اسے پورا کر
ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

مولانا خرم[۳] کی ایک اور نظم ان کے رسالہ "نصیحۃ المسلمین" کے آخر میں درج ہے جو خالص اصلاحی مقصد کے پیش نظر کہی گئی تھی۔

قاضی علاء الدین بگھروی بڑے پایہ کے عالم تھے آپ اپنے قائد کی خواہش و ایماء پر اسلامی مسائل کو نظم میں ڈھال کر پیش کر رہے تھے ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ معمولی تعلیم یافتہ لوگ ان نظموں کے ذریعہ شرعی مسائل کو از بر کر لیں ۔ حضرت موصوف نے اردو میں یہ کام شروع تو کیا مگر تکمیل سے قبل ہی شہید کر دئے گئے ۔ قاضی صاحب شہید نے جو نظم شروع کی تھی اس کے ابتدائی اشعار یہ تھے ۔

کروں حمد اس ذات بے عیب کی     غنی و صمد عالم الغیب کی
جو محتاج ہرگز کسی کا نہیں     اسی کے ہیں محتاج سب ہم کہیں[۴]

۳ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۰ ۔ ۴ بحوالہ سرگزشت مجاہدین ۔ غلام رسول مہر جلد اول ص ۹۴



گروہ مجاہدین میں ان دو بزرگوں کے علاوہ کئی اور افراد ایسے نظر آتے ہیں جن کو شعر و شاعری سے شغف تھا اور وہ تحریک کے اغراض و مقاصد کے تحت اشعار کہا کرتے تھے ۔ ان میں یہ نام قابل ذکر ہیں ۔ مولوی نصیر الدین ۔ مولانا ابوالحسن ۔ مولانا عبدالحق آروی ۔ مولانا یحییٰ علی ۔ میر قاسم علی ۔ امین اللہ پیام ۔ حکیم عبدالمجید صادق پوری ۔ مولوی محمد حسین فقیر ۔ حیدر حسن ۔ فتح اللہ ۔ عبدالرحیم ۔ شاہ نور محمد ۔ حاجی امداد اللہ ۔ مولانا شیخ محمد تھانوی ۔ مولانا یعقوب نانوتوی ۔ مولانا قاسم نانوتوی ۔

مولوی نصیر الدین[۱] کی شخصیت مجاہدین کے گروہ میں بہت نمایاں تھی ۔ حضرت سید احمد شہید اور ان کے دوسرے جانباز رفقا کی شہادت کے بعد انہوں نے ہی تحریک کی زمام کار سنبھالی اور تحریک کو زندہ رکھا ۔ وہ شعر بھی کہا کرتے تھے ۔ ان کے اشعار میں تحریک کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے ۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں ؎

اے میرے پروردگار کر دے کرم کی نظر     راہ نبی اپنے کی مجھ پہ تو کر جلوہ گر
پہنچوں اسی راہ سے خدمت عالی میں میں     مانع نہ ہو راہ کا کوئی بھی جن و بشر
کر دے مسلمان سے شرک کی باتوں کو دور     شوق ہو توحید کا، عمر ہو اس میں بسر
پھوٹ مسلمانوں سے اے میرے رب دور کر     اور انہیں ایسا بنا جیسے ہوں شیر و شکر

حضرت مولانا ابوالحسن صاحب سید احمد شہید کے بڑے معتقد تھے ، انہوں نے حضرت سید شہید کی حج سے واپسی پر ایک لمبا قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا اور ان سے اپنی عقیدت ظاہر کی تھی[۲] اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

۱ بحوالہ سرگزشت مجاہدین ۔ غلام رسول مہر جلد چہارم ص ۲۱۰ ۔ ۲ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۱ ۔

کیا کروں قافلہ سالار کا اس کے میں بیاں — جس کے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر

سید احمد وحامی حسب و فخر زماں — رہبر راہ شریعت خلف پیغمبر

رکن الدین مولوی عبدالحی و شاہ اسمٰعیل — فیض سے تیرے ہوئے کاملوں کے سر دفتر

جس میں راضی ہو خدا ہے وہی ان کو منظور — آبرو کا نہ انہیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر

مولانا یحییٰ علی بھی جنھیں انبالہ کے مقدمہ میں ماخوذ ہونے کے باعث انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً شعر کہا کرتے تھے [1]

مولوی عبدالحی آروی مہاجر و مجاہد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، شاعری بھی کرتے تھے۔ جنگ امبیلا کے واقعات پر ایک طویل مثنوی لکھی تھی جس کا نام "در مقال" ہے [2]۔

علمائے صادق پور میں مولانا ولایت علی بھی کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ رسالہ "در شرک" میں جابجا حضرت سعدی کے مضامین کو نظم میں ادا کیا ہے [3] شعر ملاحظہ ہو۔

بڑے چھوٹے ہیں سارے بے اختیار — جو چاہے کرے میرا پروردگار

مولانا ولایت علی [4] مشہور عالم اور مجاہد تھے۔ ان کو بھی شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

کریں ہیں عیش ہمارے امام جنت میں — یہاں پڑے ہیں تمہارے امام لکڑی کے

نکالو کھود کے ہندو کی طرح پتھر کا — یہ پائیدار نہیں ہوتے کام لکڑی کے

امین اللہ پیام مجاہدوں کے لشکر میں شامل تھے۔ یہ اردو میں شعر بھی کہا کرتے تھے [5] مولوی محمد حسین فقیر بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کی شان

---

[1] تحریک آزادی میں مجاہدین حصہ ص ۲۴۳ [2] ایضاً [3] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۔ اختر اورینوی [4] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۱ [5] ایضاً۔



میں ایک قصیدہ لکھا تھا [1] اس قصیدہ کے کچھ اشعار اس طرح ہیں ؎

پوچھئے نام تو ہم نام ذبیح اللہ تھے — بو عمر تھے وہ اگر پوچھئے ان کی کنیت

عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا ان کے ہو بیاں — علماء کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت

ہر جگہ دین محمد کا رواج ان سے ہوا — ظلمت دہر میں روشن ہوا نور سنت

غازی ایسے تھے کہ کیا ان کی غزا کا ہو بیاں — آب شمشیر کو پیتے تھے وہ مثل شربت

ان کی شمشیر کا زہراب ملا دیتا تھا — فوج کفار کے دریا میں عجب سمیت

یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا — سکھ سے پھر رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت

مال سے ملک سے اور جاں سے کچھ کام نہ تھا — تھا تو یہ کام حامی ہو یہ دین و ملت

"رسالہ تسعہ" میں رجز جہادیہ کے علاوہ ایک اور منظوم رسالہ بھی ملتا ہے، جس کا نام "حاذق الاشرار" ہے اس میں ۲۵۶ خمسے مختلف موضوعات پر شامل ہیں۔ مثلاً توصیف جہاد میں شاہ اسمٰعیل کی شجاعانہ جنگ۔ دھوکے بازپیروں اور باطل مرشدوں کی مذمت وغیرہ [2]

تحریک مجاہدین سے وابستہ چند بزرگوں نے کچھ کتابوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا مثلاً حیدر حسن نے عقائد نامہ شیخ عبدالحق کو عبدالرحیم نے رسالہ گناہ کبیرہ کو اور ذبیح اللہ نے رسالہ شاق الاشرار کو نظم میں ڈھالا تھا [3]

تحریک کے متوسلین میں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی دونوں ہی شعر کہا کرتے تھے۔ مولانا یعقوب [4] نانوتوی کا تخلص گمنام تھا۔ ان کا شعری مجموعہ "بیاض یعقوبی" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت قاسم [5] نانوتوی کے قصائد کا

---

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۱ [2] ایضاً ص ۲۳۲ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً۔

مجموعہ "قصائد قاسمیہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولانا احسن نانوتوی بھی شعر کہا کرتے تھے۔[1]

کچھ ایسے شعراء بھی تھے جو اگرچہ اس تحریک میں باضابطہ شامل نہیں تھے البتہ تحریک کے قائدین سے انہیں گہرا لگاؤ رہا ہے۔ مثلاً مولانا عبداللہ علوی جو شاہ اسمٰعیل کے شاگرد تھے اور سید احمد شہید کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی تھی شاعری کیا کرتے تھے۔[2] سید احمد حسن عرشی ایک بلند مرتبہ شاعر تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے والد سید شہید کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے تھے۔[3] سید عبدالرزاق حسینی جو کلامی تخلص کیا کرتے تھے۔ ایک اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے "فتوح الشام" کو "صمصام الاسلام" کے نام سے نظم کیا تھا۔ حضرت سید احمد شہید سے اپنی عقیدت کو یوں منظوم کیا ہے۔[4]

شہ اصفیا سید احمد بنام  سپہر ہدایت کے ماہ تمام

وہ تھے نور چشم امام رسل  وہ تھے عاشق خالق جزو کل

فنا عشق مولا میں وہ ہو گئے  ہیں دونوں جہاں ان کے قدموں تلے

ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم

وہ تھے ہادی و رہنمائے الم

فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور مصنف بینی نرائن جہاں جو شاعری بھی کرتے تھے[5] ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضرت سید احمد شہید سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ تحریک مجاہدین کے شاعروں میں ابوسلیمان فضلی کا نام ناقابل فراموش ہے انہوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ یہ

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً ص ۲۳۵۔



حضرت اسماعیل شہید کی اولاد میں سے تھے۔[1]

سطور بالا میں جن شعراء کے نام پیش کئے گئے ہیں ان میں بیشتر نہ تو باضابطہ شاعر تھے اور نہ ہی ان کی زندگی کا مقصد شعر و شاعری رہا ہے۔ ہاں ان بزرگوں میں اس کی صلاحیت ضرور تھی، چنانچہ تحریک کے مقاصد کے پیش نظر یہ اپنی اس خداداد صلاحیت کا استعمال گاہے بگاہے کر لیا کرتے تھے۔ لیکن ان حضرات کے ذکر سے نکل کر جب ہم اس دور کے معروف غزل گو شعراء کی طرف آتے ہیں اور ان کے یہاں اس تحریک کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر حکیم مومن خاں مومن کی طرف جاتی ہے۔ مومن تحریک مجاہدین سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ سید احمد شہید کے مرید بھی تھے[2] وہ تاحیات اس تحریک سے جذباتی طور پر وابستہ رہے۔ ان کے مختلف اشعار۔ قطعات اور نظموں کے مطالعہ سے ان کی اس گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اشعار میں سید شہید سے گہری عقیدت کے اظہار کے ساتھ ہی ان کے مقاصد کی تعریف و توصیف نیز جہاد میں شریک ہونے کی خواہش کا بڑا کھلا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ کون امام؟ امام جہانیاں احمد  کہ محض مقتدی سنت پیمبر ہے

زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد  جو کوئی اس سے مقابل ہے سو کافر ہے

---

جو سید احمد امام زمان و اہل زمان  کرے ملاحدہ بے دین سے اراد ۂ جنگ

---

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا  لبوں پر دم ہمارا ہے جو شِ خونِ شہادت کا

نہ کر بیگانہ مہر امام اقتدائے سنت  کہ انکار آشنا ہے کفر سے ان کی امامت کا

---

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے  جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوراں تلک

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۲۳۵ [2] اردو ادب کی تحریکیں ص ۴۸۸

مومن نے ایک جہادیہ مثنوی بھی لکھی تھی جس کے مطالعہ سے تحریک اور اس کے مقاصد سے شاعر کے والہانہ عشق کا پتہ چلتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبر کو جاری کروں

دکھادوں بس انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کام میں ناشکیب — ظہور امام زمان ہے قریب

وہ خضر رسول طریق خدا — کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و مہ

زہے سید احمد قبول خدا — سر امتحان رسول خدا

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات — ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدا نے مجاہد بنایا اُسے — سر قتل کفار آیا اُسے

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک — کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک

جو داخل سپاہ خدا میں ہوا — فدا جی سے راہ خدا میں ہوا

امام زمانہ کی یاری کرو

خدا کے لئے جاں نثاری کرو

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروج شہید اور صدیقؑ دے

ان اشعار کے علاوہ پروفیسر خواجہ منظور حسین نے مومن کے بعض ایسے اشعار کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں تمثیل کے پردے میں اس تحریک سے دلچسپی ظاہر کی گئی ہے۔[1]

---

[1] بحوالہ نقد و نظر علی گڑھ۔ خواجہ منظور حسین نمبر ص ۳۲۲۔



پروفیسر خواجہ منظور حسین کے مطالعہ و تحقیق کے مطابق نہ صرف مومن کے یہاں تحریک سید احمد شہید کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں بلکہ ذوق، شاہ نصیر، آتش، ناسخ، شیفتہ اور سب سے بڑھ کر غالب سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔[1]

خواجہ منظور حسین کی معرکۃ الآرا کتاب "تحریک جدوجہاد بہ موضوع سخن" پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شان الحق حقی کہتے ہیں کہ:

"خلاصۃً جناب مصنف کا کہنا ہے کہ اساتذہ اردو کے دواوین میں بہت سے مطالب جو زلف و مژگان۔ عارض و لب اور خال و خد وغیرہ کی اصطلاحوں میں بیان ہوتے ہیں ان کی ایک تعبیر اور بھی ہے اور بات دور تک پہنچتی ہے ان اشعار کے معانی کو ان کلیدوں کے ذریعہ کھولا جائے جو مصنف نے بتائی ہیں تو معلوم ہوگا کہ گذشتہ صدی کے نصف اول میں ہمارے غزل گو اساتذہ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد سے کس حد تک متاثر تھے اور یہ موضوع ان کے ذہن و تخیل پر کس درجہ مستولی رہا ہے۔"[2]

پروفیسر خواجہ منظور حسین کی تحقیق کی رو سے غالب کے فارسی اور اردو کے متعدد اشعار میں تحریک مجاہدین کے اثرات کی جھلکیاں کافی حد تک موجود ہیں۔ غالب اپنی آزادانہ طبیعت کے باوجود قائدین تحریک (حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسمٰعیل شہید) سے ایک گونہ عقیدت رکھتے تھے۔ خواجہ منظور حسین کا بیان ہے کہ "تخلیقی عمر شروع ہوتے ہی غالب کی اثر پذیر طبیعت کا سابقہ شاہ اسمٰعیل اور مولوی فضل حق جیسے دو سراسر مختلف مزاج اور متناقض مسلک کے جید (اور جابر) معلموں سے پڑا اور دونوں نے انہیں

---

[1] بحوالہ نقد و نظر علی گڑھ۔ خواجہ منظور حسین نمبر ص ۳۲۲ [2] ایضاً

اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے مخصوص عقائد کا ترجمان اور نقیب بنانے کی خاطر ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا ...

.... شاہ اسمٰعیل نے اپنی مقناطیسی شخصیت اور مجاہدانہ حرارت کے زور سے نوجوان مرزا کو کچھ دیر کے لئے زبردستی سید احمد شہید کے حلقہ ارادات میں داخل کرایا اور درپے وہ اس کے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ میدان کارزار میں گھسیٹیں مگر ان کی ذات سے انتہائی شیفتگی اور جذباتی ہم فکری کے باوجود اپنے بے تکلف دوست فضل حق کی مشفقانہ روک تھام اور ڈانٹ ڈپٹ اور خود اپنی وارستہ مزاجی اور ذوق کام جوئی کی بدولت جو بچپن ہی سے ان کی خصلت بن چکے تھے ۔ ان کا جدوجہاد کا ولولہ جسے بعد میں انھوں نے "جنون ساختہ" قرار دیا کچھ دیر کے لئے اُبلا پھر بیٹھ گیا۔ مگر یہ جذبہ ان کے دست و بازو کے رگ پٹھے سے نکل کر ان کے دل و دماغ میں سما گیا اور برابر اظہار پاتا رہا۔ دوسری طرف مولوی فضل حق کا اثر بھی بعض لحاظ سے بڑا قوی تھا [1]

ذیل میں غالب کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس غزل کے سلسلے میں خواجہ منظور حسین کا خیال یہ ہے کہ" یہ پوری غزل تحریک جدوجہد سے متعلق بعض مضامین پر مشتمل ہے۔ موصوف نے اس کے مختلف شعروں میں تحریک کی مختلف خصوصیات کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے ۔۔۔ جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے ۔۔۔ جب لخت جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

یہ اشعار خواجہ صاحب کے خیال میں سید صاحب اور شاہ صاحب کی جانفزا تقریر

[1] بحوالہ نقد و نظر علی گڑھ۔ خواجہ منظور حسین نمبر ص ۲۷۱۔



کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ؎

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر ۔۔۔ تو اس قد دل کش سے جو گلزار میں آوے

یہاں خواجہ صاحب نے "تو" سے مراد سید صاحب سے لیا ہے اور سرو و صنوبر شاہ صاحب اور مولانا عبدالحئی کو بتایا ہے [1]

خواجہ منظور حسین کی مذکورہ کتاب کا نصف حصہ غالب کے یہاں تحریک مجاہدین کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ اب دوسرے شعراء کے چند اشعار نقل کئے جا رہے ہیں جن میں خواجہ منظور حسین نے اس تحریک کے اثرات دکھائے ہیں مثلاً :

شان عشق اولیٰ ہے مجنوں دودمان عشق سے ۔۔۔ ناخلف ناقابل و نالائق و ناکارہ تھا

آتش

(مصرعہ) اپنا دیوانہ تھا اپنے واسطے آوارہ تھا

خواجہ صاحب یہاں مجنوں آوارہ سے امیر خاں پنڈاری کو مراد لیتے ہیں جو بقول شان الحق حقی ٹیپو سلطان کے بعد مسلمانوں کا واحد پشت پناہ سمجھا جانے لگا تھا۔ اس نے سید احمد شہید کی تلقین وخواہش کے باوجود ہتھیار انگریزوں کے سپرد کر دئے تھے جس کے سبب جہادیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے [2]

آتش نے مہم کی ناکامی پر اپنے تعلق کا اظہار یوں کیا ہے [3]:

؎ خاک چھانی ہم سبک روحوں نے مثل گرد باد ۔۔۔ وادی پُرخار سے تلوے سلامت رہ گئے

ذیل کے شعر میں قائدین تحریک کی مقبولیت کا حال یوں بیان ہوتا ہے ؎

؎ جلوۂ فرمانیان عشق کس دن واں نہیں ۔۔۔ روز اس یوسف کے کو میں عید اسمٰعیل ہے [4]

قائدین تحریک کی محبوبیت و مقبولیت کی طرف دوسرے شعراء نے بھی اشارے

[1] بحوالہ نقد و نظر علی گڑھ۔ خواجہ منظور حسین نمبر ص ۲۷۴ [2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

کئے ہیں، مثلاً ناسخ[1] کے اشعار پیش خدمت ہیں۔

حشر میں ناسخ بھی اپنا کھول دوں گا سلسلہ میں اسیر حلقہ گیسوے سیدزادہ ہوں

روز تاریک پھر ہوا روشن پھر ایک ذرہ آفتاب ہوا

بات جو میرے مسیحا کی ہے ایک اعجاز ہے جان آجائے تن بے جاں میں وہ آواز ہے

شاہ نصیر کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

جو حرف قم باذنی کہہ کے وہ دل دار اٹھ بیٹھا ہر ایک خواب عدم سے طالب دیدار اٹھ بیٹھا

شیفتہ کہتے ہیں ؎

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ پر تمام ہے اعجاز بات میں ہے تو جادو نگاہ میں

صیاد دلفریب کا اللہ رے لطف عام بے زخم ایک صید نہیں صیدگاہ میں

آہو کے بخت آئے جو تیری کمند میں طلبل کی قسمت آئے اگر تیرے دام میں[2]

اسی طرح ذوق[3] کے یہاں بھی اس تحریک کے اثرات موجود ہیں۔

اقبال کے فکر و فن پر بھی اس تحریک کے اثرات موجود ہیں۔ علامہ اقبال کو اسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں سید شہید اور شاہ اسماعیل شہید سے غالباً ویسی ہی گہری عقیدت اور وابستگی تھی جیسی کہ ٹیپو سلطان سے تھی[4]۔

غرض تحریک مجاہدین نے مذہب سیاست اور سماج ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اردو شعر و ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

---

[1] نقد و نظر علی گڑھ۔ خواجہ منظور حسین نمبر ص ۳۲۶ [2] ایضاً ص ۳۲۷ [3] ایضاً ص ۱۸۶ [4] ایضاً ص ۱۹۳۔



# اقبال اور اسلام

از ڈاکٹر محمد نعمان خاں*

علامہ اقبال بلند پایہ فلسفی اور مفکر شاعر تھے۔ ان کے کلام میں باقاعدہ طور پر مربوط فکر و فلسفہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے افکار کی تشکیل کے لئے مختلف زبانوں کے ادب اور فلسفہ کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اور استفادہ بھی! یہی سبب ہے کہ ہر مکتب فکر و خیال کے حامل اشخاص کی دل بستگی کا سامان اس بحر زخار یعنی کلام اقبال میں موجود ہے اور ہر نظریۂ فن کا حامل اس آئینہ خانے میں اپنا عکس دیکھ سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کلام اقبال کی اساس قرآن حکیم پر استوار ہے۔

وہ عقیدتاً پختہ مسلمان سچے عاشق رسولؐ اور عالم قرآن تھے اور قرآن کے پیغام حیات اور دین مبین کو دنیا اور آخرت کی فلاح اور نجات کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے ہر معاملہ اور مسئلہ میں قرآن کو ہی اپنا رہبر بنایا تھا۔ چنانچہ جب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے جارہے تھے تو اس وقت "ہندوستان ٹائمز" کے نمائندے نے ان سے یہ سوال کیا تھا کہ:

"راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں آپ کیا خاص بات لے کر شریک ہو رہے ہیں؟"

اقبال کا جواب تھا کہ:

"میرے پاس اور کچھ نہیں ہے، لیکن قرآن ہے، میں اسی کو پیش کروں گا"۔[1]

---

[1] (ماخوذ از "قرآن اور اقبال" از ابو محمد صالح ص ۱۷)

* شعبۂ اردو، سیفیہ کالج۔ بھوپال۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے قرآن حکیم کے پیغام کی روح کو اپنے وجود نیز فکر و فن میں ڈھال لیا تھا۔ ان کے مذہبی عقائد ان کے وسیع تر مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ تھے جس کے سبب ان کے یہاں گہرائی اور گیرائی، حقیقت اور معرفت، سوز و گداز اور متانت و وقار کے ساتھ صالح فکر و عمل کے چشمے ابلتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی عقیدے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوام انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے۔ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً للہ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوع انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔

مسلمانوں کو تو سیاست سے پہلے اشاعت اسلام کا کام ضروری ہے تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔"[1]

علامہ اقبال نے خرابی صحت کے دوران ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک وصیت اپنے بیٹے جاوید اقبال کے نام تحریر کی تھی جو "روزگار فقیر" جلد دوم صفحہ ۵۶ پر شایع ہو چکی ہے مذکورہ بالا وصیت میں جہاں بہت سے مشورے شامل ہیں وہیں اقبال نے اپنے مذہبی عقائد پر بھی اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"...میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین میں سے نہیں ہیں سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] بحوالہ اوراق گم گشتہ ص ۱۱۹۔



جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے اور بدقسمت ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لئے ہیں ان سے احتراز کرے۔

بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہو جاتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے۔ غرض یہ ہے کہ طریقۂ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہئے اور ائمہ اہل بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیئے۔"

محمد اقبال

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء۔

مالی منفعت کی خاطر تبدیلی مذہب آج کا اہم مسئلہ ہے جس پر اس وصیت میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے۔

علامہ اقبال کی نثر اور نظم ایک خاص نصب العین کی حامل ہے۔ ان کے خطبات اور مکاتیب ہوں یا فارسی اور اردو کلام ہر جگہ قرآن کریم کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اکثر مقامات پر تو انہوں نے آیات قرآنی کی منظوم تفسیر بیان کر دی ہے۔ ان کا کلام دراصل قرآن کا پیام ہے اور ان کے اصل مخاطب نوجوان ہیں وہ اسلام کا مطالعہ زمانہ حال کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے تاکہ نئی نسل اسلام کی روح کو بآسانی سمجھ سکے۔ اس ضمن میں وہ اپنے ایک عقیدت مند سید سعید الدین جعفری کے نام خط میں رقمطراز ہیں کہ:

علامہ اقبال کے ان مذہبی افکار و عقائد کی بنیاد بھی قرآن کریم پر ہی قائم ہے ۔ لہذا ان کی اہمیت اور معنویت اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے اور آئندہ عہد میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا رہے گا ۔

اقبال مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور اسلام کو مغربی علوم کا سرچشمہ سمجھتے تھے ۔ چنانچہ "اسلام اور علوم جدیدہ" کے عنوان سے منعقدہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا :

" میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے ۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، یورپ میں سائنس کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا، ان یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک یورپ کے طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے حلقوں میں علوم وفنون کی اشاعت کرتے تھے ۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علوم یکجا نہیں ہو سکتے سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے ۔۔۔۔ حالت یہ ہے کہ ڈیکارٹ کا میتھڈ (اصول) امام غزالی کی " احیاء العلوم " میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر تطابق موجود ہے کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ ڈیکارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے ۔

راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا ۔ جان اسٹورٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے بعینہ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا ۔ از مل کے فلسفہ کے تمام بنیادی اصول شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب " شفا " میں موجود ہیں ۔ غرض یہ کہ وہ تمام اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے،



" ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانۂ حال کی روشنی میں مطالعہ کئے جانے کا محتاج ہے ۔ پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی ۔ میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کرلیں تو اسلام کے Re-Interpretation میں بڑی مدد دے سکیں گے ۔

میں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ میرے نزدیک اسلام نوع انسان کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کے مصنوعی مگر ارتقائے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے اس وجہ سے اور مذاہب سے زیادہ کامیاب ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع انسان ہے اور کچھ نہیں اور میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی (Humanitarian Ideal) کو (Aohicve) کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے ، باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں ، خوش نما ضرور ہیں مگر ناقابل عمل ۔" [1]

---

۱؎ بحوالہ " اوراق گم گشتہ " ص ۱۲۵ ۔

مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔[1]

علوم جدیدہ اور اسلام سے متعلق علامہ اقبال کے اس حقیقت آمیز تجزیہ سے جہاں ہمارے شاندار ماضی کی غمازی ہوتی ہے وہیں یہ تجزیہ ہمارے حال اور مستقبل کے لئے لمحۂ فکریہ بھی ہے۔ علامہ اقبال بھی اس کے تئیں فکرمند رہتے تھے۔ چنانچہ جناب فضل کریم کے نام خط میں انہوں نے اپنی فکر و آرزو کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"عربی زبان کا علم بتدریج ختم ہوتا جارہا ہے اور مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اس پر خصوصی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ فلسفیانہ لٹریچر سنسکرت میں اتنا منتشر نہیں جتنا عربی میں۔۔۔۔ ذاتی طور پر میری آرزو یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے آپ کو ریاضی، طبیعیات، کیمیا، تاریخ اور فقہ کے مطالعے کے لئے وقف کریں۔ علم کی ان شاخوں کا مطالعہ ہی دور حاضر کا تقاضا ہے۔ صرف اسی طرح دور جدید کے مسلمان جدید علم کی جڑوں سے آشنا ہو سکیں گے اور ہم انہیں جدید دور کے مسائل کے مطالب کے قابل بنا سکیں گے۔"[2]

علامہ اقبال کی دلی خواہش تھی کہ ہر دور میں مسلمان اسلام کے اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہونے کے ساتھ علوم جدیدہ میں بھی مہارت اور کمال حاصل کریں۔ وہ فیضان نظر کے ساتھ مکتب کی کرامت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ جب ان کے ایک عقیدتمند حکیم احمد شجاع نے علوم جدیدہ کی تدریس کے لئے سرسید کی طرز پر تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے

[1] "مقالات اقبال" ص ۲۳۰ [2] مشمولہ اوراق گم گشتہ (ص ۲۰۵)



ان سے مشورہ طلب کیا تو اقبال جذبات سے مغلوب ہو گئے اور انہوں نے رقت آمیز لہجہ میں جواب دیا کہ:

"جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب! ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"[1]

علامہ اقبال دین اور دنیا دونوں کی ترقی کے خواہاں تھے اور دیگر معاملات کی طرح علم کو بھی دین کے تابع دیکھنا چاہتے تھے، ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے نام خطوط میں انہوں نے تعلیمی پالیسی اور مقاصد علم پر اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ اقبال کے نظریۂ علم کا اندازہ غلام السیدین کے نام لکھے گئے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے:

[1] ماخوذ کتاب "خوں بہا" از حکیم احمد شجاع

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہو عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبیعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے یہ علم!

علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے "جاوید نامہ" میں لکھا ہے:

علم حق، اول حواس، آخر حضور آخر او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں "جاوید نامہ" میں کئی اشعار ہیں

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم، با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا دار و مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے "بولہب را حیدر کرار کن" اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیئے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراپا رحمت ہے۔"[1]

اقبال پر بعض معترضین نے "پان اسلامسٹ" ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے چھٹے اجلاس میں جب علامہ اقبال کو "ترجمان حقیقت" کا خطاب عطا کیا گیا تو قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مذکورہ بالا الزام کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ:

---

[1] "Iqbal's Educational Philosophy" Page 88 - 89 by Ghulam - Us - Sayyadain.



"میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلامزم کی تحریک پھیلانے والا بتلایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعے قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہش مند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دار فانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے .................... جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو، اس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پان اسلامزم ہے جس کا شایع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں۔"[1]

مذکورہ بالا تقریر میں علامہ اقبال نے زندگی اور فکر و فن کے مقاصد کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ ان کا یہ مشن ان کی نگارشات نثر و نظم میں لہو بن کر گردش کر رہا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ اس لئے مثالیں پیش کرنے کے بجائے ہم یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اقبال ہی وہ پہلے شاعر، ادیب اور دانشور ہیں، جو دین مبین اور ادب اسلامی کی کامیاب ترجمانی کا حق ادا کرنے میں عہدہ برآ

---

[1] ماخوذ از "اقبال کی زندگی کا ایک پہلو" مشمولہ "ضیاباد" اقبال نمبر۔

ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مذہبی افکار و عقائد کو جس طرح شعر و ادب کے قالب میں ڈھالا ہے، ایسی کوئی دوسری مثال اردو ادب میں نظر نہیں آتی!

ان کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کے ذریعے اسلامی نظریات کی تائید اس قدر موثر طریقے سے کی ہے کہ اہل مغرب بھی اس سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کر سکے ہیں۔

علامہ اقبال کا سب سے بڑا Contribution یہ ہے کہ انہوں نے مختلف مغربی زبانوں اور ان کے علوم و ادب سے واقفیت کے باوجود قرآن حکیم کو اپنی فکر و فن کا محور بنایا اور کامیابی، شہرت اور مقبولیت کے اس بام عروج کو چھو لیا، جس تک کسی اور اردو شاعر کی رسائی نہیں ہو سکی ہے!

افسوس کہ اردو کے اہل فن نے علامہ اقبال کی اس روشن مثال سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۶۱ برس بعد بھی کوئی دوسرا اقبال ہمارے درمیان پیدا نہیں ہو سکا ہے اور غالب کا یہ شعر آج بھی ہمارے لبوں پر صدا بن کر گونج رہا ہے ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد


## اقبال کامل

از مولانا عبدالسلام ندویؒ

اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات، ان کی تصنیفات ان کے فلسفہ اور شاعری پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۷۵ روپے




## معارف کی ڈاک

# لندن سے ایک مکتوب

۱۳ جون ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ! پرسوں ایک سفر میں معارف نظر پڑا۔ فروری مارچ کے شمارے میں ساتھ لیتا آیا۔ مارچ کا شمارہ کھولا تو اعظم گڑھ کے فساد کے حوالے سے دارالمصنفین کی بپتا بھی اس میں ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کیسا المیہ ہے۔ جہاں موتی لال اور جواہر لال ٹھہرا کئے اس جگہ کو بھی اب ہندوستان میں امان نہ رہی۔ آپ کا نوٹ پڑھ کر بڑی گہری چوٹ دل نے محسوس کی۔ بگر قہر درویش بجان درویش۔ اللہ اس سے زیادہ اور نہ دکھائے۔ حالانکہ بظاہر تو دیکھنے کو رہ کیا گیا ہے؟۔

اسی شمارے میں ہمارے ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری (سنبھلی) کا مضمون مولانا احمد سعید دہلوی پر ہے۔ خدا ڈاکٹر صاحب کو خوش رکھے۔ بڑی کمی پوری کی۔ اگرچہ بہت وقت گزر جانے پر اس مضمون سے مجھے چودھری خلیق الزماں یاد آئے، ان کی کتاب "شاہراہِ پاکستان" میں مولانا مرحوم کا ایک خط نقل کر کے اس پر جو تبصرہ کیا گیا ہے کاش چودھری صاحب زندہ ہوتے تو ڈاکٹر ضیاء الدین کے مضمون کا وہ اقتباس ان کو بھیج دیا جاتا جس میں پنڈت جواہر لال کے سکریٹری جان متھائی کا تذکرہ ہے۔ مولانا نے ۱۹۳۶ء کے الیکشن اور بعد میں وزارت سازی کے حوالے سے یہ خط